تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبد الاحد اصلاحی

اصلاح پریس سرائے میر میں چھپی

۱۳۵۶ھ
۱۹۳۸ء

قیمت ۶ر

فہرست مضامین

صفحہ		نمبر شمار
۱-۲	سورہ کی دو تاویلیں۔	(۱)
۲-۷	سورہ کا اجمالی مفہوم اور ماقبل سے تعلق۔	(۲)
۷-۱۲	لفظ عصر کی تحقیق	(۳)
۱۳-۱۶	زمانہ کی قسم کیوں کھائی	(۴)
۱۸-۳۰	لفظ "وتواصوا" سے خلافت کا وجوب	(۵)
۲۰-۲۵	"حق"، "صبر"، کی شرح اور ان کا باہمی تعلق۔	(۶)
۲۵-۲۷	سورہ کی وسیع تاویل اور جوامع الکلم میں سے ہونے کی وجہ۔	(۷)
۲۷-۳۵	ایمان کا حقیقی مفہوم۔	(۸)
۳۶-۴۱	ایمان کے خاص معنی اور اس کا سیاسی مفہوم۔	(۹)
۴۱-۴۶	عمل صالح کی حقیقت۔	(۱۰)
۴۶-۴۷	حق ہمارے عروج کی غایت ہے۔	(۱۱)
۴۷-۵۲	حق و صبر کی توضیح اور ان کا باہمی تعلق۔	(۱۲)
۵۲-۵۳	عمل اور تواصی کا باہمی تعلق۔	(۱۳)
۵۳-۵۵	فرض دعوت اور آزادی قول۔	(۱۴)
۵۵-۶۴	حق و صبر کی مزید توضیح	(۱۵)
۶۴-۶۶	سورہ کا تعلق ماقبل و مابعد سے	(۱۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالْعَصْرِ ۙ (۱) زمانہ گواہی دیتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ (۲) کہ آدمی گھاٹے میں ہے

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا مگر وہ جو ایمان لائے اور بھلائیاں

الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ کیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳) اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

سورہ کی دو تاویلیں

(۱) جن لوگوں نے فصحائے عرب کے کلام کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی کلام دو معنوں کو محتمل ہو۔ عام اور خاص۔ اور حالت ایسی ہو کہ معنی خاص، کلام کے موقع اور سیاق کی پوری موافقت کے ساتھ کسی خاص قوم یا کسی

خاص حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہو اور معنی عام بھی اپنی جگہ پر نہایت محکم اور بلند ہو تو ایسے موقع پر کلام کی دو تاویلیں کریں گے تاکہ کلام موقع و محل کی مخصوص رعایات کے ساتھ اپنے عموم اور وسعت کے فوائد کو بھی باقی رکھ سکے اور ان امور کی طرف اشارہ بھی کر سکے جن کیلئے اشارہ ہی بہتر ہے، تصریح بہتر نہیں ہے۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جو تمام مفسرین اور ارباب اصول کے یہاں مسلم ہے۔ اور ہم نے اپنی کتاب اصول التاویل میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بات جاننی چاہئے کہ سورۃ العصر جوامع الکلم میں سے ہے اور اس کی دو تاویلیں ہیں۔ ایک خاص اور محدود، دوسری عام اور وسیع۔ پہلے ہم خاص تاویل کے لحاظ سے اس کی تفسیر کریں گے جس سے پچھلی سورہ کے ساتھ اس کا تعلق بھی روشنی میں آئے گا۔ اسکے بعد اس کی عام اور وسیع تاویل پر بحث کریں گے اور یہ پہلو بھی ماسبق سورہ سے بے تعلق نہ ہوگا۔

سورہ کا اجمالی مفہوم اور ماقبل سے تعلق

(۲) پہلی سورہ میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت و جاہ، طلب مال و عیش دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہیں۔ ان کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیاں

کا محمود دنیا ہے اور اسی کے عشق میں انھوں نے اپنی عمریں گنوا دیں جس سے بڑھ کر کوئی بدبختی
اور نامرادی نہیں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ایک مقام پر فرمایا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْ	کہو، میں تمھیں خبر دوں ان لوگوں
اَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا	کی جو بالکل گھاٹے میں رہے؟
اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ	(یہ وہ لوگ ہیں) جن کی تمام سرگرمی
فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا	دنیا کی زندگی میں برباد ہوئی اور
وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ	وہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑا مفید کام
یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ط	کر رہے ہیں (یعنی جمع مال کیلئے
اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا	اپنی مجنونانہ کوششوں کو دانائی سمجھتے
بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ	رہے اور جو لوگ آخرت کے کاموں میں
فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا	مشغول تھے ان کو بیوقوف خیال
نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ	کیا) یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے
وَزْنًا ط ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ	پروردگار کی نشانیوں (آیات
جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا	بعث وجزا) اور آخرت میں اسکے
وَاتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَرُسُلِیْ	سامنے حضوری کا انکار کیا، پس

هُزُوًا ط ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کے تمام اعمال برباد ہوگئے (یہی خسران عظیم ہے) اور قیامت کے دن ان کی کوئی پوچھ نہ ہوگی، یہ انکا بدلہ جہنم ہے بوجہ اسکے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری نشانیوں اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا سمجھا۔

یہ ان ارباب نعمت کا بیان ہے جو دولت کے نشہ میں انبیا اور رسل کا مذاق اڑاتے تھے اور اللہ کی نشانیوں اور روز آخرت کے منکر تھے۔

اب سورۂ والعصر پر غور کرو، ابتدائے سورہ میں ان لوگوں کی نامرادی کو بیان کیا، پھر اصلی کامیابی کی طرف اشارہ کیا کہ اس عمر فانی کے اندر نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کرکے، یہ دولت جاودان حاصل کی جاسکتی ہے۔ پس لوگوں کو چاہئے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و سرمستی کی نیند سے بیدار ہوکر، حسرت و افسوس کی ساعت سے پہلے، اس چیز کی سعی و طلب میں مشغول ہوں جو چاہنے کی ہے۔ ورنہ ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی اس بے حاصلی و بوالہوسی پر ماتم کریں گے۔ اور وہ وقت ماتم کا نہ ہوگا۔

حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی

الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ
ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ
اَعْمَلُ صَالِحًا
فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا
اِنَّهَا کَلِمَةٌ هُوَ
قَآئِلُهَا وَمِنْ
وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ
اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ
فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ
فَلَآ اَنْسَابَ
بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ
وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ
فَمَنْ ثَقُلَتْ
مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

موت سر پر آ کھڑی ہو گی وہ کہے گا
کہ اے میرے پروردگار مجھ کو لوٹا دے
(دنیا میں) تا کہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں
(مال و دولت) اس میں جا کر نیک
کام کروں۔ ہرگز نہیں: (یعنی وہ
ہرگز دنیا میں لوٹائے نہ جائیں گے)
یہ اس کی زبانی باتیں ہیں (یعنی نہ
تو اب ان کی تمنا پوری ہو گی اور
نہ یہ اپنے وعدے میں سچے ہیں) اور
ان کے پیچھے ایک پردہ ہو گا (یعنی
ایک آڑ) جو ان کے اور ان کے دنیا کی
مال و متاع کے بیچ میں حائل ہو جائیگی)
قیامت کے دن تک پس جب صور پھونکا
جائیگا تو نہ اس دن آپس کے رشتے قائم
رہ سکیں گے نہ ایک دوسرے سے مانگ

وَمَنْ خَفَّتْ
مَوَازِيْنُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْخَاسِرُوْنَ
فِيْ جَهَنَّمَ
خَالِدُوْنَ ۝

سکیں گے (یعنی بیعت کے بعد بھی وہ اپنے
دنیاوی مال و متاع اور اعوان و
انصار کی حمایت سے محروم ہونگے صرف
انکے اعمال کی مسئولیت انکے ساتھ
ہوگی) پس جنکے پلے بھاری ہونگے (یعنی
جنھوں نے خیر باقی کی کمائی کی ہوگی)
وہ لوگ کامیاب ہونیوالوں میں ہونگے۔
اور جنکے پلے ہلکے ہوں گے (اسلئے کہ انھوں نے
نیک کام نہیں کئے اور ساری زندگی
زخارف دنیا کے عشق و طلب میں
گنوا دی) وہ لوگ گھاٹے میں ہونگے
(یہ اصلی نامرادی اور بدبختی ہے) ہمیشہ
جہنم میں رہیں گے۔

ان آیات سے جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں معلوم ہوا کہ انسان کا خسران اس امر پر مبنی ہے کہ روز جزا حق ہے اور انسان چونکہ اپنے رب کے قبضۂ تصرف میں ہے اس لئے

ایک روز وہ اپنی زندگی کے تمام اعمال وافعال اور خدا کی بخشی ہوئی تمام نعمتوں
کے متعلق مسئول ہوگا۔ پس اس موقع پر ضروری ہوا کہ پہلے جزا کا اثبات کیا جائے
چنانچہ سورہ کے مطالب کی ترتیب یوں ہوئی کہ پہلے وہ لزوم جزا کو ثابت کرتی ہے
پھر اس خسارۂ عظمیٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی اس عظیم الشان نعمت
یعنی اس زندگی کے قیمتی ایام ضائع کر دینے کی وجہ سے لاحق ہوگا۔ پھر آگے بڑھکر
کامیابی اور نجات کی راہ کھول رہی ہے۔ اور یہ ساری باتیں نہایت ایجاز و اختصار
کے ساتھ صرف چند لفظوں میں بیان ہوگئی ہیں۔

لفظ عصر کی تحقیق

(۳) عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ اس لفظ میں زمانہ کے مرور و ذہاب کی طرف
اشارہ ہے۔ جس طرح لفظ "دہر" میں اس کی مجموعیت کا اعتبار ہے۔ اسی وجہ
سے اس کا اطلاق بیشتر گذرے ہوئے زمانہ پر ہوتا ہے۔ امرا القیس کا شعر ہے۔

وهل ينعمن من كان في العصر الخالي

اور ان کے لئے کیا مبارکباد ہے جو گذرے ہوئے زمانوں میں تھے

عبید بن الابرص نے کہا ہے:-

فذالک عصر قد ارانی — یحملنی بازل شبوب

وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا تھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں

"قد ارانی" یعنی حین کنت ارانی جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔

متلمس کا شعر ہے۔

عرفت لاصحاب النجائب جدة — اذا عرفوا لی فی العصور الاوائل

قطامی بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے حالانکہ وہ جاہلی نہیں تھا۔

انی اهتدیت لتسلیم علی دمن — بالغمر غیرهن الاعصر الاول

میں نے مقام غمر میں ایسے کھنڈروں پر سلام کیا جنکو گردش روزگار نے بالکل متغیر کر دیا تھا۔

اسی مفہوم میں درید بن صمہ نے بھی ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

فان لا تترکی عذلی سفاها — تلمک علیه نفسک غیر عصر

اگر تو مجھ بیوقوفی سے ملامت کرنا نہ چھوڑیگی تو زیادہ زمانہ نہ گذریگا کہ اس بات پر تیرا نفس تجھکو خود ملامت کریگا۔

"غیر عصر" یعنی "من غیر ان یمر بک کثیر زمان"

اسی مرور و ذہاب کے مفہوم کی وجہ سے تیز و تند ہوا کے لئے اعصار کا لفظ استعمال ہوا۔ دن کے آخری حصہ کو جب دن گذر کر گویا نچڑ جاتا ہے عصر کہتے ہیں۔

عنصر الشی اسی معنی کے اعتبار سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر ایک طرف زمانہ گذشتہ کے حوادث و احوال یاد دلا رہا ہے دوسری طرف زمانہ کی ایک مخصوص صفت یعنی اس کی سرعت زوال اور برق رفتاری کی طرف توجہ دلا رہا ہے اور ان دونوں حقیقتوں کی وضاحت سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر ان کے اعمال کے لحاظ سے اللہ کے فیصلے نافذ ہوں گے دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

کلام عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ایک حد تک ان حقائق سے آشنا تھے چنانچہ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ حکمت آشنا تھے انھوں نے جا بجا اپنے کلام میں ان نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثقب عبدی کا شعر ہے۔

ان الامور اذا استقبلتها اشتبهت   وفی تدبرها التبیان والعبر

معاملات جب اول اول سامنے آتے ہیں مشتبہ حالت میں ہوتے ہیں لیکن جب ان پر تدبر کرو تو ان میں بڑی بڑی بصیرتیں پنہاں ہوتی ہیں۔

قس بن ساعدہ نے کہا ہے۔

فی الذاھبین الاولین   من القرون لنا بصائر

گذر جانے والی نسلوں میں ہمارے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

اس شعر میں "بصائر" کے لفظ سے عام عبرتوں کے علاوہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ معبود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اسی شاعر نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

تباً لارباب الغفلة من	اے معشر ایاد! پچھلی قوموں اور گذشتہ
الامم الخالية والقرون	نسلوں میں سے جنھوں نے اپنی زندگیاں
الماضية يا معشر اياد،	غفلت میں گنوائیں ان کیلئے ہلاکی
اين الآباء والاجداد،	ہو کہاں ہیں آباؤ اجداد! کہاں
واين المريض والعواد	ہیں مریض اور ان کے عیادت کرنے والے؟
واين الفراعنة الشداد	کہاں ہیں طاقتور فراعنہ! کہاں
واين من بنى وشيد	ہیں وہ لوگ جنھوں نے فلک بوس
وزخرف ونجد - و	عمارتیں بنوائیں، جنھوں نے آراستہ
غره المال والولد واين	کیا اور سنوارا اور مال و اولاد کی
من بغى وطغى، وجمع	محبت نے ان کو دھوکے میں رکھا

عربی	اردو
فاوعی، وقال انا ربکم	کہاں ہیں وہ جنہوں نے سرکشی کی او
الاعلی، الم یکونوا اکثر	اکڑ گئے اور سمیٹا اور کہا انا ربکم
منکم اموالا واطول	الاعلیٰ! کیا وہ مال میں تم سے زیادہ
منکم آجالا طحنتھم	نہ تھے عمروں میں تم سے بڑھ کر نہ تھے!
الثری بکلکلہ ومزقھم	لیکن کیا ہوا؟ زمین نے انکو پیس دیا
بتطاولہ فلک عظامھم	اور اس کی دست درازیوں نے ان کو
بالیہ وبیوتھم	پامال کر دیا۔ یہ ان کی بوسیدہ ہڈیاں
خاویہ، عمرتھا	ہیں۔ ڈھے ہوئے مکانات ہیں جن کو
الذئاب العادیہ،	خونخوار بھیڑیوں نے آباد کر رکھا ہے! ہرگز
کلا بل ھو المعبود	نہیں صرف وہی معبود ہے۔

اس کلام میں جملہ خوبیوں کے باوجود ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ اس نے مجازات کا ذکر نہیں کیا۔ قرآن جب ان امور کا ذکر کرتا ہے، عدل کے پہلو کی طرف ضرور اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً۔ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا۔ یہ ان کے مسمار شدہ مکانات ہیں بوجہ اسکے کہ انھوں نے ظلم کیا۔ قس نے جہاں بغی وطغی کہا ہے اس حقیقت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا لیکن صرف زوال نعمت کے ذکر پر پہنچ کر

رک گیا۔ جزا کے معاملہ کی طرف اس کی نظر نہیں گئی۔ قرآن مجید عموماً جزا پر اُن واقعات سے استدلال کرتا ہے جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آئے۔ دوسرے صحف آسمانی کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں لزوم جزا کی دلیل کے طور پر گذشتہ قوموں کے احوال و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ باقی رہی زمانہ کی بے ثباتی اور بیوفائی تو یہ تو عربی شاعری کا نہایت پامال مضمون ہے۔ شعرا میں عدی بن زید کا تو گویا خاص مضمون ہی یہی ہے۔

اعاذل ما یدریک ان منیتی — الی ساعۃ فی الیوم او فی ضحی غد

اے ملامت گر تجھے کیا معلوم کہ میری موت آج کسی گھڑی میں آجائے گی یا کل۔

اعاذل ان الجہل من لذۃ الفتی — وان المنایا للرجال بمرصد

اے ملامت گر رندی و شاہد بازی نوجوانی کی لذتوں میں سے ہے اور انسان کی موت ہمیشہ گھات میں ہے۔

کفی زاجرا للمرء ایام دھرہ — تروح لہ بالواعظات و تغتدی

آدمی کی تنبیہ کیلئے ایام روزگار کافی ہیں جنکی ہر صبح و شام صحیفۂ عبرت کا ایک نیا ورق ہے۔ دیکھو کس قدر حکیمانہ باتیں ہیں تاہم جزا اور دار آخرت کا کوئی ذکر نہیں۔

زمانہ کی قسم کیوں کھائی؟

(۴) لوگوں کو معلوم ہے کہ پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے اگر انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں، خدا نے ان کو عروج و کمال بخشا، اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی، قانون الٰہی نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ انہی حقائق کو یاد دلانے کیلئے خدا نے زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت سے لازماً انکو بھی دوچار ہونا ہے۔ پھر زمانہ کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصلی راس المال زمانہ ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیزروی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی، روز قیامت کی باز پرس، اور جزائے اعمال کے قانون سے بالکل غافل ہے۔ اس معاملہ میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے لیکن بجائے اسکے کہ اس کو جلد سے جلد بیچ کر اپنے دام وصول کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا ہے اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا

دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت و نادانی پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

ٹھیک ٹھیک یہی حال اس غافل انسان کا ہے جو وقت کی قدر و قیمت سے غافل ہے جب موت کی گھڑی اسکے سر پر آجائے گی، حسرت و نامرادی کے سوا اسکے جیب و دامن میں کچھ نہ ہوگا۔ قرآن مجید جس نامرادی کا بار بار ذکر کرتا ہے اس کی حقیقت یہی ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا	بے شک وہ لوگ گھاٹے میں رہے
بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ	جنھوں نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو
السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا	جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب قیامت کی گھڑی
يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا	انکے سر پر دفعۃً آجائیگی وہ کہیں گے افسوس
فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ	ہماری کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے
اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ	ہوئی ہے اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھ پر
اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَ	لادے ہوئے ہوں گے اور آگاہ کہ وہ برا بوجھ
مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ	ہوگا اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر لہو لعب
وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ	اور یقیناً دارِ آخرت بہتر ہے ان لوگوں

لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۝ کیلئے جو پرہیزگاری کی راہ اختیار کریں۔

اور یہ جو قسطلانی رح وغیرہ بعض علماء نے "والعصر" کی تفسیر میں کہا ہے کہ "اقسم باللہ ھر لاشتمالہ علی العجائب والعبر" زمانہ کی قسم اس لئے کھائی کہ گوناگوں نیرنگیوں اور عبرتوں کا مجموعہ ہے، تو ان کا مطلب بھی وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے۔ کیونکہ اسی تھوڑی سی گذر جانے والی مدت کے صلہ میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیات چند روزہ کی فانی لذتوں پر ریجھ کر ابدی مسرت و کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبط نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس باطل فانی سے بے نیاز اور اس حق باقی پر ثابت قدم رہ کر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور جنت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر محض بطریق مثل ہی نہیں آیا ہے بلکہ یہ قانون جزا اور غفلت سرشت انسانوں کی نامرادی پر ایک محکم حجت ہے اور اسکے

ساتھ ہی اس میں تقویت صبر و تقویٰ کا بھی ایک پہلو ہے۔ غور کرو، قرآن کے ایک لفظ نے کس خوبی اور ایجاز کے ساتھ فوز و فلاح اور خسران و نامرادی کے دونوں پہلو بے نقاب کر دئے ہیں۔

لفظ "وَتَوَاصَوْا" سے خلافت کا وجوب

۵۔ انسانوں کی عام نامرادی بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی خصوصیات بیان کیں جنھوں نے اس حیات چند روزہ کے بدلہ ابدی مسرت و کامیابی حاصل کی۔ ان لوگوں کی تین خصوصیتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایمان عمل صالح، تواصی۔ ان تین صفتوں نے اپنے اندر دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹ لی ہیں۔ جو لوگ اس کلام پر غور کریں گے وہ پائیں گے کہ باوجود غایت ایجاز ان الفاظ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ نیکی اور بھلائی کی قسم کی کوئی بات ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ گئی ہے۔ ایمان تمام عقائد کا شیرازہ ہے۔ عمل صالح تمام شرائع کا مجموعہ ہے اور تواصی ایک رتبہ کمال و فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے مخصوص فرمایا اور اس امت میں سے بھی خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو ائمہ ہیں کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصلی ذمہ داری انہی پر ہے۔

اس تواصی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی شیرازہ بندی فرمائی اور ان کو اختلاف و نزاع کے تمام خطروں سے محفوظ کر کے بھائی بھائی بنا دیا۔ جب تک امت کے اندر یہ نظام باقی رہا، اس کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے۔ جیسا کہ اوائل خلافت میں ہم دیکھتے ہیں، لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا دفعتہً بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ قرآن مجید کی آیت ذیل میں اس فریضہ کی تفصیل کی گئی ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا	اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو جیسا
اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ	کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم
اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ	مگر اس حالت میں کہ مسلم ہو۔ اور اللہ
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ	کی رسی سب متحد ہو کر مضبوط پکڑ لو
جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کے فضل کو اپنے
وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ	اوپر یاد کرو جب تم باہم ایک دوسرے
عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً	کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں کو
فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ	باہم جوڑا اور اس کے فضل سے تم بھائی
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا	بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ
مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ
مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا
تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا
وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ
مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۝ .... (الٰى قوله تعالٰى)

کے کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے اس سے
تم کو بچایا اسی طرح اللہ اپنی آیتیں
کھول کھول بیان کرتا ہے کہ تم ہدایت
پاؤ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک امت
دعوت الی الخیر امر بالمعروف،
اور نہی عن المنکر کے لیے ہو اور وہی
لوگ فلاح پانیوالے ہوں گے اور
ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو
متفرق ہو گئے اور کھلی کھلی نشانیاں
پانے کے بعد انھوں نے اختلاف
کیا یہی لوگ ہیں جن کے لیے
عذاب عظیم ہے......
(الی قولہ تعالی).....

....كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ	....تم بہترین امت ہو جو لوگوں
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ	کی ہدایت کے لئے اٹھائے گئے
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ	ہو۔ تم نیکی کا حکم دو گے، برائی سے
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	روکو گے، اللہ پر ایمان
بِاللّٰهِ ۔	لاؤ گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے مہمات فرائض میں سے ہے چنانچہ اسکے متعلق دوسری آیات بھی وارد ہیں۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ اس کی اصلی ذمہ داری جیسا کہ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ" سے متبادر ہوتا ہے، صرف امراء امت پر ہے۔ البتہ تواصی ایک فرض عام ہے جس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں، پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اسلئے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعت امیر پر منحصر ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو۔ اس حقیقت کی مزید توضیح کے لئے حق و صبر کی

پوری تفسیر ضروری ہے اس لئے اب ہم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

"حق" و "صبر" کی شرح اور اُن کا باہمی تعلق

۶۔ حق کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی عام دوسرے معنی خاص۔ معنی عام کی تشریح ہم اس وقت کریں گے جب سورہ کی تفسیر کا عمومی پہلو بے نقاب کریں گے۔ معنی خاص کی تشریح بیان کرتے ہیں۔

حق کے خاص معنی مواسات وہمدردی کے ہیں۔ اس کے لئے دوسرا معروف لفظ "مرحمۃ" ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز دوسروں کے نزدیک محض ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت رکھتی ہے، عرب اپنے اوپر اسکو ایک حق واجب خیال کرتے تھے۔ شعراء نے اکثر اس کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ ربیعہ بن مقروم کا شعر ہے:۔

یھینون فی الحق اموالھم　　　اذا اللزبات التحین المسیما

یعنی زمانہ قحط میں اونٹ ذبح کرکے بھوکوں کو کھلاتے ہیں۔

سوید بن ابی کاہل الیشکری کہتا ہے۔

من اناس لیس من اخلاقھم　　　عاجل الفحش ولا سوء الجزع

ایسی قوم میں سے ہیں جن کے اندر عاجلانہ بدگوئی اور گھبراہٹ نہیں ہے۔

عراف للحق ما نغبي به　　عند مُر الامر ما فينا اخرع

حقوق کو خوب پہچانتے ہیں، ان کی ادائیگی سے عاجز نہیں آتے اور کٹھن وقتوں میں ہم کمزور نہیں ہوتے۔

لبید نے کہا ہے۔

فان تقبلوا المعروف نصبر لحقکم　　ولن نعدم المعروف خفا و منعما

کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ پس گویا وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ بالکل وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَۃِ کے ہم معنی ہے اور دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے۔ اب دیکھو تمام بھلائیوں اور نیکیوں میں سے قرآن نے اس نیکی کو کس طرح چھانٹ لیا ہے جو درحقیقت سب کی اصل اور سب کا خلاصہ ہے۔ صرف مرحمت ہی کا رشتۂ محبت ہے جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے دلوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کرتا ہے۔ اور سب کو جود و کرم اور فیاضی و ہمدردی کے جوش سے معمور کرکے زندہ و حساس بنا دیتا ہے۔ پہلی سورہ میں عشق دنیا کی منافسات کا ذکر تھا جو تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس میں وصیت مرحمت کا ذکر فرمایا۔ جس نے یہ جڑ یکقلم کاٹ دی۔ اس کے بعد وصیت صبر کی تعلیم فرمائی کیونکہ جب تک آدمی

لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیتیں جھیلنے اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی اور درگذر کا عادی نہ ہو جائے اس وقت تک صحیح مرحمت وجود میں نہیں آسکتی۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ	اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو
ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ	یہ کام ہمت کے ہیں

(شوریٰ)

اس آیت میں دیکھو، مرحمت صبر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی مقام کی خصوصیت نہیں، ان دونوں کے تلازم اور اجتماع کی مثالیں قرآن مجید میں عام ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ بالکل دو توام چیزوں کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ آل عمران کے خاتمہ کی آیت ہے۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ اس آیت میں امت کی شیرازہ بندی کی گئی ہے لیکن غور سے دیکھو روابط اتحاد میں گرہ صبر ہی نے لگائی ہے۔ اسی کے مشابہ یہ آیت بھی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا	مگر وہ جنھوں نے صبر کیا اور بھلائیاں
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔	کیں۔

پس سورۂ والعصر میں حق و صبر کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دو

بنیادی نیکیوں کی راہ کھول دی۔ تفسیر سورہ ماعون اور تفسیر سورہ کوثر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ اور مخلوق کی محبت ایمان کا پہلا رکن ہے۔ اور اسی چیز کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے دو لفظوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی اسی اہمیت کی وجہ سے صبر کا ذکر ان کے ساتھ بھی آتا ہے۔ نماز کے ساتھ قرآن مجید میں کئی جگہ نظر آتا ہے مثلاً

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ — اور صبر اور نماز سے مدد چاہو۔

وَالصَّلٰوةِ (بقرہ) — ....

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ — اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو

وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا — اور اس پر ثابت قدم رہو۔

لیکن عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو عاجزوں اور درماندوں کا شیوہ ہے۔ بلکہ یہ قوت اور عزم کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے۔ اور تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے۔

وغمرة موت ليس فيها هوادة — يكون صدور المشرفي جسورها

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں۔ جن پر تلواروں کے پل ہیں۔

صبرنا لها في نهكها ومصابها — باسيافنا حتى يبوخ سعيرها

ہم نے ان کے تمام آفات وشدائد کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے ہو گئے۔

اصبغ کا شعر ہے۔

یا ابن الجحاجحۃ المدارہ والصابرین علی مکارہ

اے شریف سرداروں اور شدائد پر ثابت قدم رہنے والوں کی اولاد۔

زہیر بن ابی سلمیٰ نے کہا ہے۔

قود الجیاد واصھار الملوک وصبر فی مواطن لوکانوا بھا سئموا

اصیل گھوڑوں کی سواری اور بادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھتے

صبر کے معنی قرآن مجید نے خود کھول دئے ہیں۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاۗءِ	اور صبر کرنے والے سختی میں تکلیف
وَالضَّرَّاۗءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ	میں اور لڑائی کے وقت۔

(بقرہ)

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کئے ہیں۔ غربت، بیماری اور جنگ اور درحقیقت تمام مصائب وشدائد کے یہی تین سرچشمے ہیں۔ لوگوں کی ایذا دہی پر صبر

کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ الآیۃ۔

اخلاق انسانی کی سب سے زیادہ حسین شکل یہ ہے کہ وہ شجاعت اور رزم خوئی کا ایک دل آویز پیکر ہو۔ غور کرو مرحمت اور صبر کی یکجائی نے کس طرح یہ خوبصورت پیکر آپ سے آپ تراش دیا ہے۔ اس کی تفصیلات بارہویں فصل میں آئینگی۔ پھر دیکھو، غیر معمولی ایجاز کے باوجود، کلام کی وسعت اور جامعیت کا کیا حال ہے؟ مکارم اخلاق کے تمام ابواب دو لفظوں میں سمٹ آئے ہیں۔ دو لفظوں میں تمام برکتوں کا خزانہ ہے۔ طالبوں کے لئے رہبری ہے۔ دل کے تمام روگوں کا علاج ہے۔ نفس کے تمام وسوسوں اور نزغات سے نجات کا نسخہ ہے۔

اب ہم سورہ کی اس عام اور وسیع تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی طرف اس کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

سورۃ کی وسیع تاویل اور جوامع الکلم میں سے ہونے کی وجہ

۷۔ قصار (چھوٹی سورتیں) کی تاویل و تفسیر میں، ہم جو اس قدر پھیلتے ہیں اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ یہ محض تعمق و تکلف ہے۔ بلکہ ہم ایسا ان کے معانی کی وسعت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ قصار کے وسیع معانی پر مشتمل ہونے کے دلائل

اور وجوہ بہت سے ہیں، ہم ان میں سے بعض یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ اگر قصار وسیع معانی پر مشتمل نہ ہوتیں، ان کو مستقل سورتوں کی حیثیت نہ دی جاتی۔

۲۔ ان کا نزول زیادہ تر ابتدا میں ہوا ہے۔ اور بیشتر اصولی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ ابتدا میں اصولی ہی باتیں تعلیم کی جاتی ہیں۔ اس کو بالاجمال ہم تاریخ قرآن میں لکھ چکے ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا اصول کی طرف خود قرآن مجید نے رہبری فرمائی ہے۔
كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔

۴۔ قصار کے جوامع الکلم میں سے ہونے کے اشارات خود ان کی عبارت کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

۵۔ اس باب میں سلف سے بھی ایسے اقوال منقول ہیں، جن سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے مثلاً حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے سورۂ والعصر کی بابت فرمایا۔ "اگر لوگ تنہا اسی سورہ پر غور کریں تو ان کے لئے کفایت کرے"

اب ہم سورہ پر، اسکے عمومی پہلو کو پیش نظر رکھکر غور کریں گے اور ایمان، عمل صالح، تواصی، حق اور صبر کے معانی اور ان کے باہمی تعلق کی توضیح کریں گے۔

ایمان کا حقیقی مفہوم

۱۔ ایمان کی اصل امن ہے۔ ایمان لغت میں مختلف معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

آمنہ ای اعطاہ امنا اس کو امن دیا۔ قرآن میں ہے۔ وَاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔

امن لہ۔ صدقہ واعتمد علیہ۔ اس کی تصدیق کی۔ اس پر اعتماد کیا۔

آمنہ بہ۔ ایقن بہ۔ اس کا یقین کیا۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام طریقوں سے مستعمل ہے۔ اسکے مشتقات میں سے مومن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنیوالے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔

یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے۔ عبرانی میں (אמן) (امن) کا مادہ موجود ہے جس کے معنی صدق و اعتماد کے ہیں۔ اسی سے (אָמֵן) آمین ہے جو ایک تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیت، توکل اور اذعان کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے۔ ایمان ہے۔ اور جو شخص، اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اسکے احکام پر، ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے

فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لئے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لئے طہارت اور پاکیزگی۔ اسلئے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور عقائد و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پس قرآن کی اصطلاح میں مومن وہ شخص ہوا جو خدا کا خالص و مخلص بندہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام و آیات پر یقین و اطاعت کی اس کیفیت کے ساتھ جازم ہے جس کی بنیاد رضا و محبت پر ہے۔

اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اب ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ بندوں کو ان کی سعی کے لحاظ سے درجے اور مناصب عطا فرماتا ہے۔ جو روح پاکیزگی اور طہارت کی راہ میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے، تقرب الٰہی کے مقامات و منازل سے اسی قدر قریب ہوتی جاتی ہے اور چونکہ روح کی ترقی کی دو راہیں ہیں ایک علم و عمل کے اندر سے ہو کر نکلی ہے، دوسری قلب و ارادہ کے اندر سے۔ اسلئے علم و عمل کی راہ میں اس کا ہر قدم اس کو ہدایت و تقویٰ سے قریب تر کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا	اور جنہوں نے ہدایت کی راہ پکڑی یعنی اپنے
زَادَهُمْ هُدًى	علم کے مطابق عمل کیا ان کی ہدایت زیادہ

وَاٰتٰىهُمْ تَقْوٰهُمْ۔ — کی (یعنی علم) اور انکو بخشا انکا تقویٰ

.... (یعنی صحت ارادہ کیونکہ تقویٰ ہی تمام

.... اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے۔)

پس ہر علم نافع اور عمل صالح ہدایت و تقویٰ کا دروازہ کھولتا ہے اور علم و عمل کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ — اور اب تک ایمان تمہارے دلوں

فِىْ قُلُوْبِكُمْ۔ — کے اندر گھسا نہیں ہے۔

یعنی تمہارا ایمان ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اسلئے کہ اس نے علم سے ارادہ اور قول سے عمل کی شکل ابھی نہیں اختیار کی۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ — وہی لوگ ہیں کہ ان کے دلوں میں

الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ — ایمان لکھدیا اور ان کی اپنی طرف سے

بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ — روح سے تائید کی۔

یہ ان لوگوں کی مودت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایمان قلب سے تعلق رکھنے والی اور محبت کو جوش میں لانے والی چیز ہے۔

ایک اور مقام میں فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔

اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت میں سخت تر ہیں۔

ایک جگہ فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

پس نہیں، تیرے رب کی قسم، ان کا ایمان معتبر نہیں یہاں تک کہ وہ اپنے تمام نزاعی امور میں تم کو حکم بنائیں، پھر تمھارے فیصلوں سے اپنے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں۔ اور کلی طور پر اطاعت کریں۔

یعنی جس نے اپنے نفس اور اپنے تمام عزائم و اعمال کو پوری طرح اللہ کے حوالہ نہ کر دیا وہ پکا مومن نہ ہوا۔ ایمان جن اعمال و عقائد کا مجموعہ ہے، ان میں سے اس نے صرف چند پورے کئے۔ تمام نہیں پورے کئے۔

اسی مفہوم کی یہ آیت بھی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ
إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ
وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ
آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا
وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝
الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ
حَقًّا ط

مومن تو وہی ہیں جن کا حال یہ ہے
کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے انکے
دل دہل جاتے ہیں اور جب انکو اسکی
آیتیں سنائی جاتی ہیں، انکے ایمان
کو زیادہ کرتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار
پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے
اور جو کچھ ہم نے روزی بخشی ہے اس
میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے
ہیں، یہی لوگ سچ مچ کے مومن ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے مندرجہ ذیل اوصاف گنائے ہیں۔

(۱) اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں پر خشیت طاری ہوتی ہے۔

(۲) آیات الٰہی کے سننے سے ان کا ایمان بڑھتا ہے۔

(۳) اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

(۴) نماز قائم کرتے ہیں۔

(۵) راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ بس یہی لوگ سچے اور راستباز مومن ہیں۔

اسی کے مشابہ ایک اور آیت ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ	مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اسکے
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا	کسی طرح کا تردد نہ کیا اور جان ومال
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ	سچے ہیں۔
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝	

....

آیت ذیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ	کیا جو مومن ہے وہ فاسق کی طرح
كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ	ہو جائے گا؟ (ہرگز نہیں) دونوں برابر نہیں ہوں گے

دیکھو آیت میں، اللہ تعالیٰ نے مومن کو فاسق کا ضد قرار دیا اور تصریح کے ساتھ فرمایا کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔

اس تفصیل کے بعد، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآن مجید میں، ایمان کے بعد، جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل وتوضیح ہوتی ہے۔

اور اس کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر دیکھا ہوگا کہ اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی عطف تفصیل ہے۔ کل کے بعد جزء اور عام کے بعد خاص کا ذکر کر کے تفصیل کی جاتی ہے۔ کیونکہ بعض الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں، ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے اور عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے، حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس لئے ایمان کے دو شاہد قرار دئے گئے۔ ایک قول، دوسرے عمل۔ اور چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے۔ اسلئے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اسکے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی اصلی کسوٹی ہے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

یعنی اے وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے ہو عمل سے ایمان لاؤ۔

اسی کے مثل دوسری جگہ ہے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ کہنے

أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا	پر چھوڑ دئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے۔
آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ○	اور وہ آزمائشوں میں نہ ڈالے جائیں گے
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ	اور بیشک ہم نے آزمایا ان لوگوں کو جو
قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ	ان سے پہلے تھے پس البتہ اللہ معلوم
الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ	کریگا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور معلوم
الْكَاذِبِينَ ○	کریگا ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں

پس امنوا کے بعد عملوا الصلحت کا جو ٹکڑا آتا ہے وہ درحقیقت امنوا کی تفصیل ہوتا ہے، البتہ عملوا الصلحت کو امنوا کا مقابل نہیں قرار دے سکتے۔ کیونکہ ایمان کے معنی، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، ایقان کے بھی ہیں۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سچا مومن وہ ہے جو ایمان اور عمل صالح دونوں کا جامع ہو۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح علوم سے بڑھتی ہے اسی طرح اعمال سے بھی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے دو رکن ہیں۔ ایک علم دوسرا عمل۔ ان میں سے اگر ایک کو بھی ڈھادوگے، ان کی پوری عمارت ڈہ جائے گی۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول و فروع سے خوب واقف ہے لیکن نافرمانی

اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اسکے لئے اس ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے۔ جہانتک نفس علم و یقین کا تعلق ہے، ابلیس کچھ کم نہ تھا تاہم وہ مومن نہ تھا۔ ایسا یقین معتبر نہیں۔ اس قسم کا یقین خود صاحب یقین کے خلاف حجت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب اور بڑھتا ہے۔ فرعون اور اسکے ساتھی بھی یقین رکھتے تھے لیکن ان کا یقین ایمان نہ تھا۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا	پس جب ان کے پاس ہماری
مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا	روشن نشانیاں آئیں انھوں نے کہا یہ تو
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا	کھلا ہوا جادو ہے اور ان کا انکار کیا
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا	حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا
اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ	یقین کیا، ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے
عُلُوًّا (نمل ۱۳-۱۴)	....

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کہ علم اور ارادہ بالکل دو چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں تلازم نہیں ہے۔ بحث علم کی پوری تفصیل سورہ سابقہ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

ایمان کے خاص معنی اور اس کا سیاسی مفہوم

۸۔ لیکن ایمان کے ایک خاص معنی (ایقان) کے بھی ہیں۔ قرآن مجید ان معنی میں
اس لفظ کو ہمیشہ صیغۂ فعل کی صورت میں لاتا ہے اور اس کے ساتھ اسکے متعلق کو بھی
ذکر کرتا ہے۔ مثلاً

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ	ایمان لایا (یقین کیا) رسول اس چیز
اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ	پر جو اس پر اتاری گئی اسکے رب کے جانب سے
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ	اور مومنین۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ پر
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ	اسکے فرشتوں پر، اسکی کتابوں پر، اور اسکے رسولوں پر
اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ	(اور کہا) ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا	تفریق نہیں کرتے (اور کہا بصمیم قلب)
(بقرہ)	ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

قرآن مجید کے اس استعمال سے بعضوں کو خیال ہوا کہ ایمان معتبر و حقیقی یہی ایقان
ہے اور یہ ایک یقین محض کی حالت ہے اس لئے عمل سے اس میں کوئی کمی یا زیادتی
نہیں ہو سکتی یقین اور عمل دو بالکل متباین چیزیں ہیں ایس عمل یقین کا جزو کیسے

ہوسکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہی رائے ہے جو ایمان و عمل کے باب میں حضرت امام ابو حنیفہ رح نے بھی اختیار فرمائی ہے اس سے ان لوگوں کے خیال کو مزید تقویت ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک واضح مسئلہ میں تاویل و توجیہ کے نہایت دور از کار پہلو اختیار کر لئے گئے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بالکل واضح ہے حضرت امام ابو حنیفہ نے اس مسئلہ کو بالکل اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے ایک قاضی و فقیہ دیکھتا ہے یا امیر اسلام وراثت و نکاح اور خراج و جزیہ وغیرہ معاملات و مسائل سیاسیہ کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ قانون و سیاست کی نگاہ ہے، جو حکمت و فلسفہ کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے یا مسلمانوں کے شعائر اور ان کے ظاہر حالات میں بالکل ان کے طریقہ پر ہو۔ ایسے شخص کے متعلق یہی حکم لگایا جائے گا کہ یہ مسلمان ہے۔ اس میں صادق و کاذب اور متقی و فاجر کی تفریق نہ کی جائے گی۔ اس ایمان میں سب برابر ہوں گے۔ اس میں کمی و بیشی نہیں واقع ہوتی۔ کیونکہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندہ کے درمیان کے باطنی احوال و معاملات کی جستجو نہیں کرتی۔ یہ معاملات صرف قیامت کے دن بے نقاب ہوں گے۔ سورہ حدید کی ایک آیت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ	جس دن تم دیکھوگے ایمان والے مرد
وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ	اور ایمان والی عورتوں کو، دوڑتی
بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ	ہوئی چلے گی ان کے آگے اور ان کے
بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ	دہنے ان کی روشنی (اور ہم کہیں گے) خوش
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا	خبری ہے تم کو آج کے دن۔ باغ ہیں جنکے
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا	نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ
ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ	رہوگے۔ یہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔
يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ	جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق
وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ	عورتیں ایمان والوں سے، ذرا مہلت
آمَنُوا انْظُرُونَا	دو ہم کو، ہم بھی تمھارے نور سے
نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ	روشنی لے لیں۔ اُن سے کہا جائیگا،
ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ	لوٹ جاؤ پیچھے اور ڈھونڈھو روشنی۔
فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ	پھر کھڑی کر دی جائیگی اُن کے درمیان
بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ	ایک دیوار اس میں ہوگا ایک دروازہ
بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ	اس کے اندر رحمت ہوگی

وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ	اور باہر کی طرف عذاب۔ یہ لوگ
الْعَذَابُ ؕ يُنَادُوْنَهُمْ	ان کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے
اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا	ساتھ نہ تھے؟ کہیں گے کیوں نہیں!
بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ	لیکن تم نے فتنہ میں ڈالا اپنے آپ کو،
اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ	اور راہ دیکھتے رہے اور شک میں
وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ	پڑے رہے اور تم کو دھوکے میں رکھا
الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ	آرزوؤں نے۔ یہاں تک کہ آپہنچا اللہ کا
اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ	حکم اور اللہ کے بارے میں تم کو دھوکے
بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ فَالْيَوْمَ	میں رکھا شیطان نے۔ پس آج نہیں
لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ	لیا جائیگا تم سے فدیہ اور ان لوگوں
وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانا
مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ	جہنم ہے وہی ہے تمہاری رفیق اور برا
مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ	ٹھکانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دنیا کی زندگی میں تو مومنین کے ساتھ ہے لیکن آخرت میں ان سے علیحدہ کردی جائے گی اور اس کا حشر کفار

کے ساتھ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا اسی حالت میں ممکن ہے جب امیر اسلام مسلمانوں کو
اور ان لوگوں کو جو اگرچہ مسلمان نہیں ہیں لیکن زبان سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں،
معاملات میں بالکل یکساں درجہ دے پس امام ابو حنیفہ نے اس بحث میں ایمان سے
اسکے خاص مفہوم یعنی ایقان کو نہیں مراد لیا ہے بلکہ مجرد اقرار و اظہار مراد لیا ہے۔
یعنی ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا محض قول کا؟
یہ سوال نہ تھا کہ علم و عمل دونوں کا نام ہے یا محض علم کا۔ اگر سوال مؤخر الذکر صورت
میں ہوتا تو اس کا جواب محض ایک ہی ہوتا۔ کیونکہ اس بارہ میں دو رائیں نہیں
ہوسکتیں کہ ایمان علم و عمل دونوں کا مجموعہ ہے۔

اب غور کرو اس بارہ میں ایک قاضی کا مسلک کیا ہوگا؟ وہ ایمان کو صرف
قول کے معنی میں لیتا ہے۔ ایسا کرنے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے لیکن یہ
ایمان کی کمی اور بیشی کا محل کیسے ہوسکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی کی نظر
میں ایمان سے صرف وہ چیز مراد ہوتی ہے جو احکام قضا کے اجراء و نفاذ کی بنیاد
ہے۔ اس کو ایمان کی حقیقت، اسکے اجزائے ترکیبی اور اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات
سے بحث نہیں ہوتی۔ اب اگر قرآن ایمان کی کمی اور زیادتی کی تصریح کرتا ہے تو
اس تصریح کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے اور قرآن

اس سے ایک بالکل ہی مختلف بات کہتا ہے۔ بلاشبہ قرآن کا صاف فیصلہ یہی ہے کہ ایقان و عمل دونوں ہر حالت میں یکساں نہیں رہتے۔ ان میں مختلف حالات کے ماتحت تغیر و تفاوت ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کم ہوتے ہیں کبھی زیادہ۔ عقل سلیم اس صداقت کی تائید کرتی ہے۔ پچھلی فصل میں ہم اس کی تفصیل کر چکے ہیں۔

عمل صالح کی حقیقت

۱۔ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ایک جامع کلمہ ہے جس میں تمام اعمال حسنہ سمٹ آئے ہیں۔ اور یہ مسئلہ کا ایک ظاہر پہلو ہے، جو محتاج تشریح نہیں ہے لیکن یہاں ایک دقیق نکتہ بھی ہے جس پر غور کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ کو "صٰلِحٰت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے ایک عظیم الشان حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیاوی، شخصی و اجتماعی جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمال حسنہ ہیں۔ یعنی عمل صالح وہ عمل ہوا جو انسان کی زندگی اور نشو و نما کا سبب ہو اور اللہ تعالےٰ نے اس کی فطرت میں جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کے مطابق وہ عروج و ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ جائے۔ یہی چیز انسان کے غایت وجود کو پورا کرتی ہے اور

اسی سے وہ درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔ فطرت انسان سے یہی چیز مراد ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ — اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔

اور آیت ذیل میں عبادت سے یہی چیز مقصود ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝ — اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر تاکہ میری عبادت کریں۔

عبادت یعنی طاعتِ الٰہی جس پر تمام شخصی و اجتماعی صلاح و فلاح کا دارومدار ہے۔

اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی اس مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس لئے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لئے پسند فرمائی ہے۔ کیونکہ خدا نے اس دنیا کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک خاص نظام و حکمت ہے جو اس پورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اس نظام و حکمت کے ماتحت ہو اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔

اور یہ جو تم اس کائنات کے ہر گوشہ میں ایک کشمکش اور تصادم دیکھ رہے ہو

تو یہ بھی درحقیقت اس کائنات کی ترقی اور نشو و نما ہی کے لئے ہے۔ یہ تغیر و تحول کا ایک سلسلہ ہے جو ہر پرانی حالت کو ایک نئی حالت سے بدل رہا ہے تاکہ یہ نظام اپنی حالت پر قائم رہ سکے۔

قرآن مجید میں صاف تصریح ہے کہ انسان کا ارتقا عمل صالح پر مبنی ہے اور تمام عالم، اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ایک خاص حکمت کی طرف جا رہا ہے۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ	اسی کی طرف عروج پاتا ہے کلام
الْكَلِمُ الطَّيِّبُ	طیب اور وہ عمل صالح کو رفعت بخشتا ہے
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ	(انسان کا یہ عروج عمل صالح اور اس نیت
يَرْفَعُهٗ وَالَّذِيْنَ	حسن کا نتیجہ ہے جو اس کائنات کی خلقت سے
يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ	اللہ تعالیٰ کا منشا ہی) اور جو لوگ برائی کی
لَهُمْ عَذَابٌ	سازشیں کرتے ہیں۔ ان کیلئے سخت عذاب ہے
شَدِيْدٌ	اور ان لوگوں کی تدبیر نامراد ہوگی (کیونکہ بری
وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ	تدبیریں اس حق کے خلاف ہیں جو کائنات کی
هُوَ يَبُوْرُ	اصلی روح ہے اسلئے جو کوشش اسکے ابطال کیلئے
....	ہوگی اللہ تعالیٰ اسکو فروغ نہ دیگا کیونکہ اس

کائنات کی تخلیق کا منشا درحقیقت ایک عظیم الشان غایت حکمت ہی جس کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں حق ہے۔

اس اصول کی ایک سے زیادہ آیات میں تشریح ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ	اور ہم نے نہیں بنایا آسمان و زمین کو
وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا	اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔
لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ	کھیل کرتے ہوئے۔ اگر ہم چاہتے کہ بنائیں
نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ	کوئی کھلونا تو ہم اس کو بناتے اپنے
مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ	پاس اگر ہم کو کرنا ہی ہوتا۔ بلکہ ہم
بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ	ماریں گے حق کو باطل پر پس وہ اس کا
عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ	سر توڑ ڈالے گا اور باطل دفعتہً برباد
فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ	ہو جائے گا اور تمہارے لئے خرابی
الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ	ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان
(الانبیاء)	کرتے ہو۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی کہ زمین کی وراثت صالحین کیلئے کیوں مخصوص ہوئی۔ مفسدین اس غایت کے خلاف چلتے ہیں جو اس عالم کی تخلیق کا منشا ہے اور صالحین اس روش پر چلتے ہیں جو صحیح منزل مقصود پر پہنچاتی ہے۔ اسلئے فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ

جو لوگ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں البتہ ہم ان کو داخل کریں گے صالحین میں۔ یعنی صلحا کے زمرہ میں جو درحقیقت انبیا، صدیقین اور شہدا کا زمرہ ہے۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں مفسدین کی ہلاکت اور صالحین کی برکت کا ذکر اکثر آیا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ	اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھدیا ہے
مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ	کہ زمین کے وارث ہمارے صالح بندے
الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ	ہونگے بیشک اس میں پیغام یعنی
الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا	پیام خوشخبری ہے عبادت کرنے
لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝	والی قوم کیلئے۔

"عبادت کرنے والی قوم" یعنی وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابعدار ہو کیونکہ تمام صلاح و تقویٰ کی جڑ، جیسا کہ معلوم ہوچکا، یہی ہے۔ نافرمان شخص صرف اپنا ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کا دشمن ہوتا ہے۔ اسکے پیش نظر صرف اپنا نفس ہوتا ہے۔ اسلئے وہ شرائع و حدود کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کی بہبود درحقیقت سب کی بہبود سے وابستہ ہے۔ باقی رہے صالحین تو وہ زمین کے نمک ہیں۔ تمام عالم کی اصلاح و ترقی انہی کے دم سے ہے۔

وہ جو کچھ سوچتے اور کرتے ہیں تمام عالم کیلئے کرتے ہیں اور صرف اپنے ابنائے زمانہ ہی کے لئے نہیں کرتے بلکہ ان نسلوں کے لئے بھی کرتے ہیں جو ان کے بعد آئینگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ وراثت عالم اور خلافت الہیہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

حق ہمارے عروج کی غایت

۱۱۔ حق اصل میں موجود قائم کو کہتے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے اس کے معانی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال عام ہے۔

(۱) وہ بات جس کا وقوع قطعی ہو۔

(۲) وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔

(۳) وہ بات جو اخلاقاً واجب ہو۔

قرآن مجید نے اس لفظ کو ان تمام معانی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ۔ بے شک اہل دوزخ کا یہ جھگڑا ضرور واقع ہوگا۔ فَرُدُّوْا اِلٰی مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ۔ وہ اپنے حقیقی مولے کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے یعنی ایک دین واجب کی حیثیت سے۔

باقی رہے وہ خاص معنی یعنی ضعفاء کی ہمدردی جس کا ذکر ہم نے پانچویں فصل میں کیا ہے تو وہ اسی عام معنی سے متفرع ہے گویا اہل عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر مستطیع پر لازم اور ہر مستحق کو حاصل ہے جو عقل کے نزدیک مسلم اور تمام لوگوں کے نزدیک متعین و معروف ہے اسی لئے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی بات جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہے اور ایک قانون مسلم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق بمعنی مواسات کے اندر ان تمام معانی کی جھلک ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ پس اگر حق کو اس کے عام اور وسیع معنی میں لو تو اس چیز کو کہیں گے جو عقل و دل دونوں کو ایک ساتھ محبوب ہو اور علم و عمل دونوں پر حاوی ہو جائے اور جور و فساد کی ضد ہو۔

اسکے بعد ہم حق و صبر کی حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ان دونوں کے درمیان جو باہمی تعلق ہے وہ واضح ہو سکے اور اس سورہ کا نظم اسکے معنی کی وسعت کے لحاظ سے سامنے آجائے۔

حق و صبر کی توضیح اور انکا باہمی تعلق

۱۲- نجات کا دارومدار عقلی اور اخلاقی قوی کی اصلاح پر ہے اور عقل و دل دونوں

کے شدت و لینت کے اعتبار سے دو پہلو ہیں۔ عقل کی لینت اور نرم خوئی کا پہلو یہ ہے کہ وہ فوراً حق کے سامنے جھک جانے کے لئے مستعد رہے۔ وہ جہاں بھی اور جس وقت بھی ظاہر ہو۔ اور قلب کی لینت یہ ہے کہ وہ خالق کی محبت اور مخلوق کی ہمدردی میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ پس عقل حق پر ایمان لاتی ہے۔ حق کیا ہے؟ اللہ تعالےٰ اس کی صفات، اس کی آیات۔ اور قلب اپنی بندگی کا احساس کرتا ہے اور پھر بیتابانہ اپنے مولائے حقیقی کی طرف بڑھتا ہے اور خلق کی ہمدردی کا جو فرض اس پر عاید ہوتا ہے، اسکے جوش و احساس سے معمور ہو جاتا ہے۔

عقل کی شدت کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حق پر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، ثابت قدم رہے اور اس باطل کو جو نگاہوں کے سامنے موجود ہے چھوڑ دے اور اس پہلو سے قلب کا فرض یہ ہے کہ وہ مصائب و شدائد کے مقابل میں اپنے قدم جادۂ مستقیم سے نہ ڈگمگانے دے اور قدرت کے وقت عفو و درگذر سے کام لے۔

یہ حق کا تعلق قلب و عقل سے ہوا۔ بالکل یہی حال صبر کا ہے۔ وہ بھی عقل اور دل دونوں سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اجمال ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق اصل مطلوب و محبوب ہے اور صبر اس کیلئے جوش طلب

اور سرگرمی ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ....

بیشک جن لوگوں نے کہا یعنی سچائی کے ساتھ ہمارا رب اللہ ہے (یہ قول یقین [illegible] وطاعت دونوں کا مجموعہ ہے کیونکہ جو ربوبیت کا اقرار کریگا وہ یقین وطاعت

یعنی حق کو قبول کیا پھر اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ حصول سعادت کے بعد اصلی چیز استقامت اور دوام ہے۔ اب غور کرو، دو لفظوں۔ حق وصبر کے اندر تمام معانی اور بھلائیاں کس خوبی اور اختصار کے ساتھ جمع ہوگئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ صبر صرف اسی وقت مطلوب نہیں ہے جب انسان تمام بھلائیوں کو حاصل کر چکے بلکہ ہر نعمت خیر کے بعد تمسک اور استقامت کی ضرورت ہے تاکہ انسان مزید نعمت کا مستحق ہو سکے۔ صبر درحقیقت تمام بھلائیوں کا معاون ہے۔ اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ اس کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو سب سے پہلے صبر کی تعلیم فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انکے

ساتھی کا جو واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے ساتھی نے سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ سے صبر ہی کا مطالبہ کیا اور اسی چیز میں انکا
امتحان لیا۔ اس کی مزید تفصیل پندرہویں فصل میں آئے گی۔ یہاں محض اس
بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ حق و صبر درحقیقت ہماری سیر باطن کے
دو قدم ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہاں درحقیقت تفصیل و تفریع کا ایک سلسلہ
ہے۔ ایمان ایک اصل اور مرکز کی حیثیت سے تھا، اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اسکی
تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ، دل اور دماغ دونوں کو محبوب ہے اور
اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس لئے اس محبت کے نتیجہ
کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ کیونکہ محبت کا اقتضا یہ ہے کہ شے محبوب کے لئے ثابت قدمی
اور استقامت پیدا ہو اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ثابت قدمی اور استقامت
محبوب کی حیثیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ جو شے جس قدر محبوب ہوگی اس
کے لئے اسی قدر پامردی اور استقلال کا جوش ابلے گا۔ مدافعت، غضب اور غیرت
کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لئے یکساں نہیں ہوتا متفاوت ہوتا ہے۔ جو شے
دل کو جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کیلئے اسی درجہ کا جذبہ غضب و غیرت بھڑکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے غضب و انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے۔ اس لئے جو لوگ حق کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شے تمکو عزیز و محبوب ہے کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لوگے؟ اس کی حمایت کے لئے تمھاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی۔ ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت آتا ہے، ماں کو بچہ کی حمایت میں قربان کر دیتی ہے۔ یہی جوش حمایت و غیرت قوموں میں اپنے قومی و وطنی حقوق و مقاصد کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے لئے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے۔ اپنے کمزور پروں سے ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبت حق سے پیدا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہ یہ کہ "حق" جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، سر تا سر غیب ہے اس وجہ سے اسکے لئے صبر کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ — پس ثابت قدم رہو بیشک اللہ کا وعدہ

حَقٌّ ضرور واقع ہوگا۔

حق و صبر کے باہمی تعلق کے ان پہلوؤں کو برابر پیش نظر رکھو۔

۱۳۔

عمل اور تواصی کا باہمی تعلق

۱۳۔ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اہل حق و صبر ہیں اور ان چیزوں پر عمل کرنے کے بعد دوسروں کو ان کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تفصیل آیت کے اندر موجود ہے لیکن اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی ہے کیونکہ اولاً تو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس پر مشتمل ہے ثانیاً وعظ بے عمل کی برائی اس قدر واضح ہے کہ اس موقع پر جو مدح کا ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوا اسی طرح عمل صالح سے تواصی وجود میں آیا کیونکہ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کے لئے صبر و استقامت کی تمام کڑیاں جھیل لے گا، اس کے بارہ میں اس کا علم، اس کی محبت، اس کی غیرت ہر چیز بڑھ جائے گی۔ اور اب وہ صرف اسی قدر نہیں چاہے گا کہ خود اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ تمام دنیا اس سے

عشق کرے۔ اور جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھیگا

تڑپ جائے گا۔ اور ایک غیور اور شریف نوجوان کی طرح دوسروں کو ابھاریگا۔

کہ حق کی حمایت کے لئے آمادہ ہوں اور اس کا یہ ابھارنا بھی درحقیقت خود اسی کی

حمایت حق کا ایک جزء ہوگا۔ پس یہاں تواصی، عمل صالح کے ایک جزء کی حیثیت سے

ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر تفصیل و توضیح کے طریقہ پر فرمایا ہے۔

پھر اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ عمل صالح ہی امن اور تمدن کی بنیاد ہے۔

پس اس اعتبار سے عمل صالح کا سب سے اہم جزء توصیہ حق و صبر کو ہونا چاہیے۔ قرآن مجید

میں ان دونوں کے اجتماع کی ایک اور لطیف مثال بھی ہے۔ فرمایا ہے۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو۔

اس آیت میں "بر" درحقیقت حق کے قائم مقام ہے اور "تقویٰ" صبر کی

ایک دوسری تعبیر ہے اس لئے کہ تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو لغزش کے مواقع پر

حمایت حق میں ثابت قدم رکھنا۔

فرض دعوت اور آزادی قول

۱۴۔ گذشتہ صفحات میں عمل صالح، حق، صبر اور تواصی وغیرہ کی جو تفسیر ہم نے

بیان کی ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک سورہ کے چند الفاظ کے اندر سیاست، تعاون اور اتحاد معیشت کے کیا کیا اصول فرائض بیان فرمائے ہیں۔ اور اجتماع کے عام معاملات و احوال سے الگ تھلگ رہنے کے خیال کا کس طرح ابطال کیا ہے۔ اور چونکہ یہ سورہ صرف امور مہمہ کے بیان کے لئے مخصوص تھی اس لئے اس میں تواصی کا ذکر کرنا ہمارے دعویٰ پر صاف حجت ہے۔

پھر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم پر تواصی کا فرض عاید کیا ہے تو لازماً ہم کو اظہار حق کے لئے آزادی قول بھی بخشی ہے۔ چنانچہ ہم اسلام کے اصول میں یہ بات پاتے ہیں کہ ایک طرف تو امت پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ وہ امیر کی کامل اطاعت کرے اور دوسری طرف اس پر یہ ذمہ داری بھی عاید کی گئی ہے کہ وہ حق کا اعلان کرے اور نصیحت کا کلمہ کہنے میں ہر خوف سے بیباک ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء کے لقب سے ممتاز فرمایا اور خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ بڑھیا عورتیں انکو بر سر منبر ٹوک دیتی تھیں اور وہ ان نصیحتوں کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا تاکہ لوگوں کو کلمہ حق کہنے کی جرأت ہو۔ چنانچہ صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی رائیں پوری بیخوفی سے ظاہر

کر دیتے تھے اگرچہ ان میں سے کسی کی رائے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف ہو۔

لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ آزادی رائے فتنہ و فساد کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارا اصلی فرض بر و تقویٰ کے لئے تعاون ہے۔ اس اصل عظیم کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ اس لئے اگر ایسا ہو کہ ہم کسی معاملہ میں کوئی رائے دیں اور ہماری وہ رائے نہ مانی جائے تو ہم کو فتنہ و فساد کا حق حاصل نہ ہوگا۔ عصیان و انکار کا حربہ آخری حربہ ہے۔ جب تمام اسلحہ بیکار ہو جاتی ہیں، اس وقت یہ ہتھیار اٹھایا جاتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب تمام جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو۔ آیت وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ الخ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اس لئے یہاں سرسری اشارہ کافی ہے۔

حق و صبر کی مزید توضیح

۱۵۔ اگر پچھلی فصلوں کو تم نے بغور پڑھا ہے تو یہ بات بالکل صاف نظر آگئی ہوگی کہ حق و صبر کی حیثیت درحقیقت دو عظیم الشان پہاڑوں کی ہے جن پر شریعت غرائے اسلامیہ کے ستون اور اس ملکوت اللہ کے ارکان قائم ہیں۔

اوپر گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے حق یعنی عدل و حکمت کے ساتھ چنانچہ فرمایا۔

لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ	اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی
لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ	کرتا تو آسمان و زمین دونوں درہم
وَالْاَرْضُ۔	برہم ہو جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا اس زمین کی خلافت اور نبوت و شریعت کی نعمت کسی قوم کو بخشتا ہے تو اسکے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم حق کی اطاعت کرنے والی اور قسط کو قائم کرنے والی ہو۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو عدل کے قائم کرنے
قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ	والے ہو۔ اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے
لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ	(یعنی قسط کی گواہی) اگرچہ خود تمہارے خلاف ہو۔

قسط سے مراد حق ہے اور علم اور عمل دونوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

"وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" دوسری جگہ فرمایا "وَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ" ایک جگہ ہے "قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ" "وَالَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ

"بِالْقِسْطِ" پھر فرمایا "یَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ" اسی طرح "قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ" "ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ" "فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ" "وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لازمی فرمایا ہے کیونکہ اس نے آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اسی بنا پر قائم کی ہیں۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ	اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے
خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ	پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو
فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ	(یعنی قسط کے ساتھ) اور خواہش کے پیچھے نہ چلو
بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى	(کیونکہ یہ حق کے راستہ سے انحراف ہے) کہ تمھیں اللہ
فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ	کے راستہ سے ہٹا دے (اس آسمانی بادشاہت کے
اللّٰهِ إِنَّ الَّذِيْنَ	راستہ سے جسکے تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلیفہ
يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ	مقرر کیے گئے ہو) بیشک جو لوگ اللہ کے راستے
اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ	سے بھٹک جاتے ہیں ان کیلیے سخت عذاب ہے۔ بوجہ اسکے
شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا	کہ انھوں نے حساب کے دن کو فراموش کر دیا۔ (حساب
يَوْمَ الْحِسَابِ	کا دن یعنی ظالموں کو بدلہ پانے کا دن) اور نیز

وَمَا خَلَقْنَا	نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے
السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ	درمیان ہے باطل (یعنی اپنی مخلوق کیلئے کیسے
وَمَا بَيْنَهُمَا	پسند کر سکتا ہوں کہ وہ حق کے راستے سے منحرف
بَاطِلًا ذٰلِكَ	ہو جائے) یہ (یعنی آسمان و زمین کا بے مقصد
ظَنُّ الَّذِيْنَ	باطل پیدا ہونا) ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے
كَفَرُوْا	کفر کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کا انکار کیا

اب صبر پر غور کرو۔ جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب بخشی پہلے انکے
صبر کا امتحان لیا اور جب اس امتحان میں پوری اتریں، اپنی عزت و نعمت کے تاج
سے ان کو سرفراز فرمایا۔ اور ایسا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی عظیم الشان پل یا بلند عمارت
تعمیر کرنی ہے تو اسکے لئے سب سے پہلے ایک ایسی سخت زمین کی تلاش ہوتی ہے
جس پر ایک ٹھوس بنیاد قائم کی جا سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قوموں کے انتخاب کے
معاملہ میں ایسا ہی کرتا ہے۔ پہلے ان کو مصائب و شدائد میں آزماتا ہے جب اس میں
وہ بالکل پکی ثابت ہوتی ہیں، اپنی امانت ان کے حوالہ کرتا ہے اور ان کو ایک نئی امت
کی صورت میں نئی طاقتوں سے مسلح کر کے کھڑا کرتا ہے اور ان کے تمام دشمنوں کو پامال
کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قانون ابتلا کا بار بار ذکر فرمایا ہے

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ
الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ
وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ

اور ہم تم کو آزمائیں گے یہاں تک کہ جان لیں
یعنی تم میں سے مجاہدین کو اور ثابت قدموں کو
اور جانچ لیں تمہارے احوال کو۔

دوسری جگہ فرمایا۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ
فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ
مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ
نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ
شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ
الْكٰفِرِيْنَ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ

اگر تمکو زخم پہنچا تو زخم کی بات نہیں تھا
مخالفوں کو بھی زخم پہنچا اور یہ ایام لوگوں
کے درمیان ہم پھیر بدل کرتے رہتے ہیں،
اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو تم
میں سے ایمان لائے (سچے پکے) اور بنائے
تم میں سے شہداء (یعنی امت عدل) اور اللہ
نہیں دوست رکھتا ظالموں کو اور تاکہ
پاک صاف کر دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے
اور مٹا دے کافروں کو۔ کیا تم نے گمان
کر رکھا ہے کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں
اور ابھی تک نہیں معلوم کیا اللہ نے ان

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا — لوگوں کو جو تم میں سے مجاہد ہیں اور نہیں معلوم

مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝ — کیا ان لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

اور بنی اسرائیل کے قصہ میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ ان کی عزت و ذلت کا مدار تمام تر صبر پر ہی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو جو کچھ بخشتا ہے ان کے اعمال کے اعتبار سے بخشتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔ جو اللہ کی مدد کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ اللہ ثابت قدموں کو دوست رکھتا ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ اور ہم نے ان میں امام بنائے جو ہدایت کرتے تھے ہمارے امر سے جبکہ وہ ثابت قدم رہے۔ انبیائے کرام کے حالات پڑھو اس سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے ایک مدت تک آزمائشیں جھیلیں اور مصائب برداشت کیے یہاں تک کہ ان کی استقامت کی پوری آزمائش ہوگئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ — پس ثابت قدم رہو جس طرح ثابت

اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ — قدم رہے انبیاء اولو العزم اور ان کیلئے

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ — (کفار کیلئے) جلدی نہ کرو۔

یعنی ان پر عذاب یا غلبہ کے لئے جلدی نہ کرو۔

اللہ تعالےٰ کا یہی طریقہ اس پورے کارخانۂ کائنات کے اندر نافذ ہے۔ اس نے ہر چیز کے لئے ایک ٹھہرائی ہوئی مدت اور ایک اندازہ کی ہوئی مہلت بخشی ہے تاکہ ہر چیز اپنے مقدرہ عروج و کمال کو پہنچے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو قویٰ ودیعت فرمائے ہیں وہ تمام ظہور میں آئیں۔ اس لئے وہ ظالموں پر عذاب کرنے میں عجلت نہیں فرماتا بلکہ ان کی مقررہ مدت تک ان کو مہلت بخشتا ہے

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ — اور اگر اللہ لوگوں سے ان کے کئے پر
بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى — (فوراً) مواخذہ کرتا تو زمین کی پشت پر
ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰكِنْ — ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو
يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى — ایک مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے پس
فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ — جب آجائیگی انکی اجل تو بیشک اللہ اپنے
اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا — بندوں کا نگران حال ہے۔

یعنی جب مقررہ اجل آجائے گی تو اللہ تعالیٰ قانون حق کے مطابق ان کا فیصلہ فرمادے گا۔ یہی وہ صبر ہے جو تدبیر و انتظام کائنات کے عالم میں حلم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر مقامات پر صبر کا حکم

فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ	مانگا مانگنے والے نے واقع ہونیوالا عذاب
وَّاقِعٍ لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ	کافروں کیلئے اس کو کوئی دفع کرنے والا
لَهُ دَافِعٌ مِّنَ اللَّهِ ذِي	نہیں ہے آئیگا زینوں والے اللہ کی
الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ	جانب سے۔ چڑھتے ہیں اسکی جانب
وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ	فرشتے اور روح ایک ایسے دن میں
كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ	جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہے
أَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ	صبر کرو خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ
صَبْرًا جَمِيلًا إِنَّهُمْ	اسکو دور خیال کرتے ہیں اور ہم
يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ	اس کو قریب دیکھتے ہیں۔
قَرِيبًا	....

اگر تم قوموں کی تاریخ پر غور کروگے، دو باتیں نہایت صاف نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ خدا کا قانون عدل ہر گوشہ میں جاری و نافذ ہے۔ اور ہر معاملہ کی آخری کروٹ حق کی طرف ہوتی ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قانون بندوں کے معاملہ میں نہایت حلیم ہے وہ ان کو

آخری حد تک مہلت دیتا ہے تاکہ جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں پوری طرح آزمائے کہ وہ کونسی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جنھوں نے کفران نعمت کیا اور تباہ ہوئے یا ان لوگوں کی جنھوں نے شکر کیا اور اطاعت کی راہ پر چل کر منزل مقصود کو پہنچے۔ فرمایا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ	اور ہم نے بہت سی قوموں کو تم سے پہلے
مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا	ہلاک کیا جبکہ انھوں ظلم کیا اور آچکے
وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ	ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی
بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا	نشانیاں لیکر اور نہیں تھے ایمان لانے
لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي	والے اور ایسے ہی ہم بدلہ دیتے ہیں مجرم
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ	قوم کو۔ پھر ہم نے بنایا تم کو ان کے بعد
جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ	جانشین ان کا زمین میں تاکہ دیکھیں
فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ	تم کیا عمل کرتے ہو۔
لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ	....

اور حلم اور صبر دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر، حق کی بنیاد ہے پس اگر اللہ تعالیٰ عذاب میں جلدی فرمائے تو وہ حکمت باطل ہو جائے گی جس کو وہ ظاہر فرمانا چاہتا ہے اور وہ حق ظہور میں نہ

آسکے گا جو اس تمام کائنات کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی زمین اور آسمان کی فطرت کے اندر جو مصالح و حکم ودیعت ہیں ان کو ظاہر فرماتا ہے۔ اس پر ایک حد تک چھٹی اور بارہویں فصل میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں اس لئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

حق اور حلم دونوں کے مزاج میں کس قدر نمایاں تفاوت ہے ایک سرتاپا سخت گیری اور احتساب کا مظاہرہ ہے۔ دوسرا یکسر عفو و درگذر کی خاموشی! لیکن اسکے باوجود تم نے دیکھ لیا کہ یہ دونوں اس طرح ساتھ ساتھ نمودار ہوتے ہیں گویا دونوں بالکل توام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان دونوں کا علم ایک ساتھ فرمایا تاکہ ایک ہی وقت میں ہمارے لئے ہماری باطنی و ظاہری اخلاق کی اصلاح کے دروازے بھی کھول دے اور زمین کی وراثت اور آسمان کی تمام نعمتیں اور برکتیں بھی بخشدے اور ہم اس راہ پر گامزن ہوجائیں جو بندگی اور خلافت الٰہیہ کی تکمیل کی راہ ہے اور جو ہمارے اس پروردگار نے کھولی ہے جو عدل اور عفو کو پسند کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ اس کائنات کا انتظام فرماتا ہے۔ اس بحث کی پوری تفصیل ہماری کتاب ملکوت اللہ میں ملے گی۔

سورہ کا تعلق ماقبل وما بعد سے

۱۷- سورہ کے موقع اور نظام کی توضیح کے لئے کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

کیونکہ سابقہ سورہ، جیسا کہ جان چکے ہو، ان ارباب نعمت کے خسران کے بیان میں ہے جو زخارف دنیا کی طلب میں منہمک ہیں۔ اور بعد والی سورہ میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں یہ ارباب نعمت مبتلا ہوں گے۔ پس یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی تاکہ ان کی آرزؤں کی نامرادی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے۔ اسی ضمن میں مومنین کے خصائل بتا دئے اور کامیابی کے راستہ کی طرف اشارہ فرما دیا اور یہ وہی متقابلہ والا اصول ہے جو قرآن مجید میں بہت عام ہے۔ مثلاً اچھوں کے ذکر کے ساتھ بروں کا ذکر آتا ہے اور جنت کے ساتھ دوزخ کا بیان ہوتا ہے۔

اور اس سورہ کا تعلق ماقبل سورہ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسا اس آیت کے اندر ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اے ایمان والو، نہ تم کو غفلت میں ڈالیں
لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا	تمھارے مال و اولاد اللہ کی یاد سے اور جو
اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ	ایسا کرے گا تو وہی لوگ گھاٹے
یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	میں ہوں گے اور اللہ کی راہ میں
الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا	خرچ کرو اس روزی

رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ
أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ
لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ
فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ
الصَّالِحِينَ ۝

میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہے اس سے
پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت اس کے
سر پر آ جائے۔ پس وہ کہے اے میرے رب
کیوں نہ دی تو نے مجھ کو کچھ مہلت کہ میں
صدقہ کرتا اور بنتا نیکوکاروں میں سے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کر اس سے سورۂ تکاثر اور سورۂ والعصر کا باہمی تعلق بالکل واضح ہو جائے گا۔ ھذا ولا یحیط بعلمه وکلماته الا ھو۔
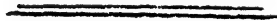
تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبد الاحد اصلاحی

اصلاح پریس سرائے میر میں چھپی

قیمت

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ
۱	سورہ کا عمود	۲ - ۴
۲	سورہ کا تعلق آگے اور پیچھے سے	۴ - ۵
۳	سورہ کا نظم اور اُسکے اجزاء کا باہمی تعلق	۵ - ۸
۴	شہادت کا عمومی پہلو	۸ - ۱۴
۵	معاد کے ظاہری و باطنی دلائل	۱۴ - ۲۳
۶	معاد پر ایک تاریخی شہادت	۲۳ - ۲۷
۷	قریش اور ثمود	۲۷ - ۳۱
۸	ایک لطیف اشارہ	۳۱ - ۳۴
۹	ایک اشارہ امت مرحومہ کے باب میں	۳۵ - ۴۱
۱۰	قوموں کے مواخذہ کا قانون	۴۱ - ۴۳
۱۱	امت مرحومہ میں ناقۃ اللہ کی مثال	۴۳ - ۴۵
۱۲	حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی مثالیں	۴۵ - ۵۰
۱۳	سورہ کے ربط پر دوبارہ نظر	۵۰ - ۵۲
۱۴	"ولا یخاف عقبٰھا" کی تفسیر	۵۲ - ۵۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ	شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا
اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا	اور چاند جب اس کے پیچھے لگے۔ اور دن
جَلّٰهَا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا	جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے
وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَ	ڈھانکے اور آسمان اور جیسا اس کو
وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا	اٹھایا اور زمین اور جیسا اس کو پھیلایا
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا	اور دل اور جیسا اس کو بنایا۔ پس
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا	اس کو سمجھ دی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا	ہوا جس نے اسے صاف کیا اور ناکام
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا	ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔ ثمود نے
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا	جھٹلایا اپنی سرکشی سے جبکہ ان کا نحس
اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا فَقَالَ	ترین آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پیغمبر خدا نے

لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ نَاقَۃَ
اللّٰہِ وَسُقْیٰہَا فَکَذَّبُوْہُ
فَعَقَرُوْہَا فَدَمْدَمَ عَلَیْہِمْ
رَبُّہُمْ بِذَنْبِہِمْ فَسَوّٰہَا
وَلَا یَخَافُ عُقْبٰہَا
....

ان سے کہا خبردار خدا کی اونٹنی اور
اس کے پینے کی باری سے۔ سو پیغمبر کو
جھٹلایا اور اونٹنی کو کاٹ ڈالا۔ تب
خدا نے ان کے گناہ کے بدلے ان پر
غضب نازل کیا اور انھیں ناپید کر دیا
اور وہ نہیں ڈرتا کہ پیچھے کیا ہوگا۔

سورہ کا عمود

۱۔ اس سورہ میں قریش اور ان کے بدبخت سردار کے لئے انذار و تخویف ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کی دعوت کی جو سرتاسر توحید۔ ہمدردی اور جزا کی تعلیمات پر مشتمل تھی، تکذیب کی تھی۔ اور اسلوب بیان اجمال کا ہے نہ کہ تصریح کا۔ یعنی صرف ان کی سرکشی اور ڈھٹائی کا ذکر کیا ہے۔ ان امور کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے۔ اور اس کے وجوہ ہیں۔

۱۔ سورہ ماسبق و مابعد میں ان امور کی تصریح موجود تھی۔

۲۔ یہ امور قرآن مجید میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بار بار بیان ہو چکے ہیں۔

۳۔ اس سورہ کی شہادتیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، ان امور کی تصریح کے لئے کافی ہیں۔ کذبت ثمود بطغوٰھا میں اگرچہ ان چیزوں کی تصریح نہیں ہے جن کی ثمود نے تکذیب کی تھی لیکن وہ راز نہیں ہیں کیونکہ ثمود نے حضرت صالحؑ کی تکذیب کی تھی اور ان کی دعوت، توحید، ایمان بالآخرت اور ہمدردی کی دعوت تھی۔

۴۔ سورہ کا اصلی زور انذار پر ہے اس لئے انذار ہی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ دوسرے مطالب اس کے مقابل میں دب گئے ہیں تاکہ مخاطب کی توجہ منتشر نہ ہو۔ اور کلام کی پوری تاثیر ان کی سرکشی اور غرور کو پگھلا سکے۔ چنانچہ صرف ایک ہی بات کا ذکر فرمایا جو ان کی جسارت اور نامرادی دونوں کی جامع تھی۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا۔

یعنی پیغمبر نے ان کو متنبہ کر دیا کہ اگر انھوں نے سرکشی کی اور اونٹنی کو گزند پہنچایا تو ان پر خدا کا عذاب آدھمکے گا۔

پس یہ ایک مثل ہے جو قریش کی تذکیر و تنبیہ کے لئے بیان کی گئی ہے اور جو کچھ وہ اپنے رسول کے ساتھ کرنے والے ہیں اس کے انجام کو ان کے سامنے

پہلے سے رکھدیا گیا ہے تاکہ وہ آگاہ رہیں۔

یہ اجمالی اشارات ہیں، انکی تفصیل ساتویں اور آٹھویں فصل میں ملے گی۔

سورہ کا تعلق آگے اور پیچھے سے

(۲) سابق سورہ (سورۃ البلد) میں اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمۃ کا ذکر ہوا تھا۔ "اصحاب المشئمۃ" یعنی وہ لوگ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ پہچانی اور اس کی امانت اور بیت اللہ کے فرائض میں بدعنوانیاں کرکے بدبختی میں پڑے۔ اس سورہ میں ان لوگوں کے سامنے قوم ثمود کے اس بدبخت ترین انسان کو بطور مثال پیش کیا ہے جس نے اپنی سرکشی کی بدولت پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں ڈھکیلا تاکہ قریش دیکھ لیں کہ وہ بھی اسی بدبخت انسان کی راہ چل رہے ہیں۔ انھوں نے بیت اللہ کے اصل مقصد کو بالکل برباد کر دیا ہے اور آیندہ اپنے رسول کے ساتھ بعینہٖ وہی معاملہ کرنے والے ہیں جو ثمود نے کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح خانہ کعبہ کی بے حرمتی ان کی بدبختی اور نامرادی کا سبب ہوئی اسی طرح رسول کی بے حرمتی ان کی بربادی کی آخری ساعت ہوگی۔

اس انذار کے بعد سلسلہ سخن مواساۃ وہمدردی کے ذکر کی طرف متوجہ

ہوگیا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے نیکوکاروں اور مال سمیٹ کر رکھنے والے بخیلوں کے احوال و نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر انہی کے انجام کار کی تفصیل بعد کی سورہ (سورۃ اللیل) میں آئی ہے، جیسا کہ اس کی تفسیر سے معلوم ہوگا۔

سورہ کا نظم اور اس کے اجزاء کا باہمی تعلق

(۳) ان آیات کے باہمی نظم پر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ اس سورہ میں پندرہ آیتیں ہیں اور ان سب میں جزاء کی شہادت ہے۔ ابتدائی دس آیتیں عام دلائل فطرت میں سے ہیں۔ اور بقیہ پانچ مسلم تاریخی شہادتیں ہیں۔ اور یہ اسلوب قرآن مجید میں عام طور پر پاؤگے کہ تاریخی دلائل کے پہلو بہ پہلو فطری دلائل بھی بیان ہوتے ہیں اور ان کا انداز بیان کبھی قسم کا ہوتا ہے کبھی خبر کا۔ اور یہ بات ہم اپنی کتاب الامعان فی اقسام القرآن میں بیان کر چکے ہیں۔ کہ قسم کا مقصود دلائل کا بیان ہوتا ہے۔

قسم کے اسلوب پر، دلائل فطرت کے بیان اور پھر ان کے بعد تاریخی شہادتوں کے ذکر کی مثال سورہ فجر میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاً فجر کی

دس راتوں کی جفت اور طاق کی، اور شب کی (جبکہ وہ ڈھل جائے) کی گواہیاں
پیش کی ہیں۔ اس کے بعد دنیا کی بعض سرکش قوموں مثلاً عاد، ثمود اور فرعون
کے احوال و واقعات بطور شہادت سنائے ہیں۔ یہی انداز سورۂ الذاریات
میں بھی ہے۔ پہلے دلائل فطرت ہیں، اس کے بعد قوم لوط، قوم فرعون، عاد،
ثمود، اور قوم نوح کی سرگذشتوں کو تاریخی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔
اس نظم کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ ایک غیر قسمی اسلوب کی عمدہ مثال
سورہ سجدہ کی یہ آیت ہے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ	کیا ان کو اس بات سے ہدایت نہ
أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ	ہوئی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتیں
الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي	ہلاک کر ڈالیں جنکی بستیوں میں یہ چلتے
مَسَاكِنِهِمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ	پھرتے ہیں۔ بیشک اس میں نشانیاں
لَآيَاتٍ ۚ أَفَلَا يَسْمَعُونَ	ہیں (جزا، عدل، اور قدرت الٰہیہ کی)
أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ	تو کیا یہ لوگ سنتے سمجھتے نہیں (یہ واقعات
الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ	کیا انھوں نے نہیں دیکھا یعنی اگر سنا
فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ	نہیں تو کیا دیکھا بھی نہیں) کہ ہم بادلوں کو

مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ	ہانکتے ہیں چٹیل زمین کی طرف پھر نکالتے
اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ وَيَقُوْلُوْنَ	ہیں اس کے ذریعہ کھیتی کو جس میں سے
مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ	کھاتے ہیں ان کے چوپائے اور وہ خود تو
صَادِقِيْنَ	کیا وہ لوگ دیکھتے نہیں! اور پوچھتے
....	ہیں کب یہ فیصلہ ہوگا (یعنی حق و باطل
....	کے درمیان) اگر تم سچے ہو؟

اس آیت میں پہلے تاریخی واقعات سے جزا کو ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد بعثت اور ربوبیت پر واقعات فطرت سے استدلال کیا ہے۔ سورہ قمر میں بھی یہی انداز ہے۔ پہلے لزوم جزا پر ایک فطری دلیل پیش کی ہے۔ اس کے بعد قوموں کی ہلاکت کے احوال و واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ	قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا
الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً	اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو اعراض
يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ	کریں گے اور کہیں گے یہ پرانا جادو ہے
مُّسْتَمِرٌّ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْا	اور انھوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشوں
اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ	کے پیچھے چلے۔ اور ہر کام کا ایک وقت

مُسْتَقِرٌ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ	متعین ہے اور ان کے پاس اتنے
مِنَ الْاَنْبَاءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ	حالات پہنچ چکے ہیں جنمیں کافی تنبیہ ہے،
حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ	بھر پور حکمت۔ پس ڈراوے کیا
النُّذُرُ	نفع دیتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور مختلف سورتوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ اسلوب عام ہے۔ البتہ اس امر پر غور کرنا ہوگا کہ آفتاب و ماہتاب، رات اور دن، اور زمین و آسمان کی گواہی یہاں کس بات پر پیش کی ہے۔ اور اس کے پہلو کیا کیا ہیں؟ پہلے ہم اس اسلوب پر ایک عمومی نظر ڈالیں گے۔ اس کے بعد شہادت کے پہلو بے نقاب کریں گے۔

شہادت کا عمومی پہلو

(۴) اس کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی نہ کسی صفت کا جلوہ نہ ہو۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ نہیں ہے کوئی چیز مگر اس کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے صفات حسنیٰ کی گواہی دے رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ وہ عموماً صرف اپنی بڑی بڑی

نعمتوں کو یاد دلاتا ہے کیونکہ انسان ان سے اسی حال میں انکار کرسکتا ہے جب بالکل اندھا بہرا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بالعموم اپنی قدرت و حکمت کی ایسی ہی ابھری ہوئی نشانیوں کا حوالہ دیا ہے جن کو ہر احساس رکھنے والا وجود بغیر کسی کاوش کے پالیتا ہے، مثلاً سورج، چاند، رات، دن، آسمان، زمین۔ اور کبھی کبھی چھوٹی نشانیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی نشانیاں بے شمار ہیں، ان کو کوئی گن نہیں سکتا۔

قرآن مجید کا عام انداز استدلال یہ ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ	بیشک آسمانوں اور زمین کی خلقت
وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ	اور رات اور دن کی گردش میں نشانیاں
الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ	ہیں عقل والوں کے لئے یعنی
لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ الَّذِيۡنَ	جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے
يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيَامًا	اور لیٹے اور آسمان اور زمین کی خلقت میں
وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ	غور کرتے ہیں (اور پکار اٹھتے ہیں) اے
وَيَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ	ہمارے رب یہ کارخانہ تونے بے نتیجہ نہیں
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ	بنایا ہے (یعنی اس کارخانہ کائنات کے اندر

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا
بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ....

جو آثار حکمت ہر گوشہ میں ابھرے ہوئے
نظر آتے ہیں ان سے وہ اس نتیجہ پر
پہنچتے ہیں کہ یہ کارخانہ بالکل بے نتیجہ اور
بے غایت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا
کہ ایک لا انتہا مدت تک بغیر کسی
عدالت و حکمت کے ظہور کے یوں ہی
چلا جائے۔ پس فکر و نظر کی اس منزل
میں پہنچکر وہ خدا کی حمد و تسبیح میں ڈوب
جاتے ہیں اور پھر یہیں سے وہ جزا،
کا یقین حاصل کرتے ہیں اور بے تحاشا
انکی زبانوں پر کلمہ استغفار جاری ہو جاتا
ہے (تو پاک ہے پس ہم کو آگ کے
عذاب سے بچا۔

یہ حکمت اور جزا پر استدلال ہے۔

اسی طرح اس کارخانہ کائنات کے اندر اس کی رحمت عامہ اور ربوبیت

کی جو نشانیاں ہیں ان سے اپنی توحید پر استدلال کیا ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	اور تمھارا معبود ایک معبود ہے نہیں
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ	ہے کوئی معبود مگر وہ رحمٰن و رحیم بیشک
الرَّحِيْمُ اِنَّ فِيْ خَلْقِ	آسمانوں اور زمین کی خلقت میں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ	اور رات اور دن کی آمد و شد میں
اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ	اور کشتیوں میں، جو لیکر چلتی ہیں سمندر
وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي	میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ	اور پانی میں جو اللہ نے آسمان سے
وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ	اتارا پس اس کے ذریعہ زندہ کیا زمین
السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا	کو اسکی موت کے بعد اور پھیلائے اس
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ	کی گردش میں اور بادلوں میں جو
وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ	آسمان اور زمین کے درمیان بندھے
السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ	ہوئے ہیں، نشانیاں ہیں ان لوگوں
وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	کیلئے جو عقل رکھتے ہیں (اس استدلال

يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ	کے بعد ان لوگوں کی حماقت پر تنبیہ فرمائی
مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	جو اسقدر کثیر اور واضح آیات کے باوجود
اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ	خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں) اور بعض
اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ شریک
اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ	ٹھہراتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں۔
....	جیسی اللہ سے کرنی چاہیے اور جو ایمان
....	والے ہیں وہ سب سے بڑھکر اللہ ہی سے
(البقرہ ۱۶۴-۱۶۵)	محبت کرتے ہیں۔

قرآن مجید اس قسم کی مثالوں سے معمور ہے جن پر غور کرنے کے بعد، پوری یقین کے ساتھ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نشانیاں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی دوسری صفات کمال پر دلیل ہیں اور پھر انہی سے قیامت کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ اور ان کا دلیل ہونا یوں بھی واضح ہے کہ قرآن مجید نے جگہ جگہ ان کے دلیل و حجت ہونے کی تصریح کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ستاروں اور آفتاب و ماہتاب سے توحید پر استدلال کرنے کے بعد فرمایا:-

تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ	اور یہ ہماری حجت ہے جسکو ہم نے دیا ابراہیم کو

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک مناظرہ نقل کیا ہے جو ان کے اور ایک کافر بادشاہ کے درمیان ہوا ہے اور جس میں انھوں نے آفتاب کی تسخیر سے استدلال کر کے حریف کو بحث میں بالکل عاجز و درماندہ کر دیا ہے۔

پھر قرآن مجید نے دلیل کے اعتبار سے ان کو محض اشارات و کنایات کا رتبہ نہیں دیا ہے، بدیہیات اور یقینیات کا درجہ بخشا ہے۔ ایک جگہ آسمان و زمین کی خلقت کو توحید اور جزا کی دلیل کے طور پر بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ	پس اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ
صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ	میں تم کو ڈراتا ہوں کڑک سے جو عاد و
عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ	ثمود والی کڑک کی طرح ہوگی۔

یعنی یہ دلیل جو ان کو سنائی گئی واضح ترین حجت ہے۔ اس کے بعد اعراض و انکار کیلئے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ اگر اس کو بھی وہ نہیں مانتے تو معلوم ہوا کہ ان کا اعراض دلیل کے خفاء اور معاملہ کی عدم وضاحت کی وجہ سے نہیں ہے، شرارت اور سرکشی کی وجہ سے ہے۔ اور جن لوگوں نے یہ حالت اختیار کر لی ہو، ان کیلئے اب صرف یہ بات باقی رہ گئی ہے کہ ان پر عاد و ثمود والا عذاب نازل ہو۔ قرآن مجید میں اس اسلوب کی مثالیں بکثرت ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آفتاب و ماہتاب کی گردش، روز و شب کی آمد و شد زمین و آسمان کی خلقت اور ان کے عجائب میں توحید و رحمت، عدل و جزا اور بعثت کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ اوپر ہم نے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی توضیح کی ہے۔ اور آئندہ فصل میں انشاء اللہ اس کی مزید توضیح ملے گی۔

معاد کے ظاہری و باطنی دلائل

۵۔ آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی دلالت۔ ان امور پر جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ایک خاص پہلو توجہ دلانے کے قابل ہے اور اس وقت ہم بالاجمال اسی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس سورہ میں مقابلہ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو شہادت میں پیش کیا ہے، ان کو تنہا حالت میں نہیں پیش کیا ہے۔ ان کے مقابل اور جوڑے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سورج کے ساتھ چاند ہے، رات کے ساتھ دن ہے، آسمان کے ساتھ زمین ہے وعلم جرا اور قرآن مجید کی تصریح سے یہ بات ہم کو معلوم ہے کہ اشیاء کے جوڑے جوڑے ہونے میں ہمارے لئے بے شمار دلائل حکمت پنہاں ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۔ فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۔ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۔

اور ہر چیز سے ہم نے بنایا جوڑا، تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو (یعنی وہ خالق حکیم ہی جو ہر وجود کو اسکے جوڑے کیلئے موزوں اور سازگار بناتا ہے اور سب پر قابو رکھتا ہے) پس بھاگو اللہ کیطرف، بیشک میں تمہارے لئے اسکی طرف سے کھلا ہوا ہوشیار کرنیوالا ہوں (وہی تمہارا رب اور معبود ہے اور اسی کیطرف تم کو لوٹنا ہے) اور نہ بناؤ اللہ کیساتھ کوئی دوسرا معبود بیشک میں تمہارے لئے اسکی طرف سے کھلا ہوا ہوشیار کرنیوالا ہوں، (یعنی وہی تنہا تمہارا پروردگار ہے)

دوسری جگہ فرمایا:-

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ

شاہد ہے رات جب ڈھک لے اور دن جب روشن ہو اور نر و مادہ کی آفرینش کہ تمہاری کوششیں مختلف ہیں۔

اس کے آگے اس سعی مختلف کا بدلہ بیان فرمایا ہے۔ اب غور کرو اس کلام کا سیاق ہم کو اس تقابل کی طرف کس طرح متوجہ کر رہا ہے، جو اس نظام کائنات کے ہر گوشہ میں موجود اور اس تمام سعی و عمل کے ہنگامہ کا اصلی محرک ہے اور جو خود ہمارے نفس کی تربیت کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ کیونکہ نفس انسانی کا تمام شرف و کمال اس ریاضت پر مبنی ہے جو اس کو دو بالکل متضاد میلانات کی کشاکش کے اندر کرنی پڑتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی طولانی ہے، البتہ بعض اشارات تفسیر سورۂ تین میں ملیں گے۔

یہاں ہمارے پیش نظر بحث کا صرف اتنا حصہ ہے جتنا اس سورہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کائنات کی ہر چیز، غور سے دیکھو، ایک پہلو سے بالکل کامل اور مستقل ہے۔ دوسرے پہلو سے ناقص اور محتاج۔ اور اس میں حسن و حکمت کا اصلی جمال اسوقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ چیزیں باہم جڑ کر اپنے اس نقص و احتیاج کے خلا کو پر کر لیتی ہیں۔

پھر ذرا اور گہری نظر سے دیکھو گے تو تمھیں نظر آئے گا کہ یہ دنیا متضاد عوامل اور متقابل قویٰ کی ایک رزمگاہ ہے۔ یہاں زندگی اور موت، تخریب اور تعمیر کی ایک باہمی آویزش ہر گوشہ میں سرگرم کار ہے۔ جن کی نگاہیں تہ تک پہنچنے کی عادی نہیں ہیں وہ اس حالت سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف لااغراض اور جنگ جو دیوتاؤں کا ایک اکھاڑہ ہے۔ یہی مقام ہے جہاں مجوس کو ٹھوکر لگی اور

پھر یہیں سے مختلف بت پرست قوموں نے بہت سے ایسے عقائد و نظریات ٹھہرائے جو بعض اعتبارات سے مجوس کی ضلالتوں سے بھی زیادہ سخت و شدید ہیں۔ حالانکہ یہ ٹھوکر محض فکر و نظر کی کوتاہی سے لگی۔ جن کی نگاہیں کشاکش اور تصادم کے ان ظاہری مناظر سے گذر کر ان حکم و مصالح تک پہنچ گئیں جو اس تصادم کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ان کو یہ حقیقت صاف دکھائی دی کہ اس دنیا کی خالق صرف ایک قادر و قیوم ذات ہے اگر وہ ذات ایک نہ ہوتی تو دو متضاد قسم کے عناصر اور قویٰ کی کشمکش سے اندر آسمان و زمین کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاتا۔ کما قال :-

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا . . .	اگر ان دونوں کے اندر (آسمان و زمین) اللہ کے سوا (اللہ واحد) اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو جاتے۔
وَمَا اتَّخَذَ اللهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	اللہ نے اپنے لئے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ کوئی معبود اس کا ساجھی ہوا اور اگر یہ بات ہوتی تو ہر معبود اپنی مخلوق کو لیکر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔ . . . .

پس اس کائنات کے اندر قویٰ اور عوامل کا جو تصادم ہے، نگاہ کو اس پر ٹھہر نہیں جانا چاہئے۔ ان مصالح تک نفوذ کرنا چاہئے جو اس تصادم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت نظر آئے گا کہ اس آسمان کے نیچے ہر چیز جوڑوں کے اتصال و تعانق سے وجود میں آتی ہے۔ اور تمام مصالح و فوائد کا سرچشمہ متضاد و متصادم قویٰ کا وجود ہے۔ قانون قدرت یوں ہے کہ دو چیزیں آپس میں ٹکرا کر اپنے سے ایک بالاتر حقیقت کو وجود میں لاتی ہیں۔ اس کارخانہ کے اندر شر محض کا وجود نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ خیر مطلق ہے۔ حسن و خوبی کی تمام صفتیں اور کمال و کبریائی کی تمام عظمتیں صرف اسی کیلئے مخصوص ہیں۔ پس اس دنیا میں جو چیزیں ہمیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں وہ درحقیقت باہمدگر معاون ہیں۔ اس پوری دنیا کو اس کی مجموعی حالت میں دیکھو۔ یہ مختلف اجزاء و عناصر اور متضاد قویٰ اور عوامل کی ایک نہایت دلفریب اور حسین وحدت ہے اور یہ تمام متضاد حالتیں، یمین و یسار، آسمان و زمین، سردی اور گرمی، خوشی اور رنج، نیکی اور بدی اسی وحدت کے احوال و عوارض ہیں۔ اب اس کو دوسرے سادہ لفظوں میں اجمال کے ساتھ یوں بھی سمجھ سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوقات کو بعض کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ مثلاً علل کو معلولات کے ساتھ، طبائع کو ارادات کے ساتھ، قویٰ کو آلات کے ساتھ، اجساد کو نفوس کے ساتھ، اعمال کو جزا کے ساتھ اور دنیا کو آخرت کے ساتھ۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ	پس پاک ہے وہ ذات جس نے پیدا
الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ	کئے تمام جوڑے نباتات زمین کی قسم میں سے
الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ	اور خود ان کے اندر سے اور ان چیزوں کے
وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ	اندر سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قانون کس قدر ہمہ گیر ہے۔ اور اس پر جسقدر غور کرو اسی قدر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور رحمت بے نقاب ہوتی ہے۔ اور ہم کو تسبیح و تحمید کی دعوت دیتی ہے۔

لیکن جنھوں نے اس دنیا کی ہر حقیقت کو صرف اس کی اکہری حالت میں دیکھا ہے۔ دوہری حالت میں نہیں دیکھا۔ یعنی جوڑے کے صرف ایک فرد پر نگاہ پڑی اور دوسرے فرد کو نہ دیکھ سکے۔ ان پر اس کائنات کا اصلی حسن و جمال بے نقاب نہ ہو سکا۔ وہ طرح طرح کی خرابیوں میں پڑ گئے۔ اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اور جو صرف دنیا کو دیکھے گا اور آخرت پر اس کی نگاہ نہ پڑے گی۔ اس کو یقیناً دنیا نہایت مکروہ بدمنظر اور ہولناک صورت میں دکھائی دے گی اور وہ اس معاملہ میں سخت متردد ہوگا کہ اس کی خالق کوئی ایسی ذات ہے، جو حکیم و رحیم ہے کیونکہ دنیا میں ظلم و معصیت کے وحشتناک مناظر ہیں وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو اس بات پر جمنے نہ دیں گے۔

اس معاملہ کی پوری تفصیل دوسری سورتوں میں ملے گی۔ یہاں اس سے زیادہ پھیلنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تمہید کو سمجھ لینے کے بعد "وَالشَّمْسِ" سے لیکر "وَضُحٰهَا" تک کی تفسیر پر غور کرو گے تو تمہیں یہ بات نظر آئے گی کہ جو نظام اس عالم جسمانی میں قائم ہے بعینہ اسی طرح کا نظام عالم روحانی کے اندر قائم ہے۔ مثلاً اس نظام جسمانی کے دو جانب ہیں۔ روشنی اور تاریکی، بلندی اور پستی اور ہر جانب کے ساتھ اس کائنات کی ایک خاص مصلحت وابستہ ہے اور ان دونوں جانبوں کے اجتماع سے انسان کی پرورش اور فلاح و بہبود کے گوناگوں پہلو ظہور میں آتے ہیں۔ قدرت نے زمین کو ایک فرش بنایا اور اس پر انسان کی معیشت کے لئے طرح طرح کی نباتات اگا دیں۔ اور رات کو ڈھانک کر پرسکون بنایا اور اس میں اس کے لئے راحت و خوش عیشی کا بستر بچھا دیا۔ بالکل یہی حال عالم روحانی کا ہے۔ اسمیں بھی زمین و آسمان اور رات اور دن ہیں۔ اور ان دونوں کی تدبیر سے روح کی ترقیاں اور کامیابیاں ظہور میں آتی ہیں اور یہی مقام ہے جہاں پہنچکر انسان پر خدا کی حکمت و رحمت اور اس کی حکومت قاہرہ کے کچھ اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّجَعَلَ فِيهَا	سراپا برکت ہے وہ ذات جس نے بنائے آسمان میں برج اور رکھا اسمیں چراغ

سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا هُوَ — اور روشن چاند اور وہی ہے جس نے بنایا
الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ — رات اور دن کو آگے پیچھے آنیوالا
وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ — اس کے لئے جو چاہے یاد دہانی حاصل
اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا — کرنا یا چاہے شکر کرنا۔

"جو چاہے یاد دہانی حاصل کرنا" یعنی اس امر کو یاد کرنا چاہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبر اور پروردگار ہے۔ یا چاہے "شکر کرنا" یعنی اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ نے اس تمام کارخانہ کو رحمت کے محور پر چلایا ہے۔ سورہ رعد کی آیات (۲-۵) میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (الی قولہ تعالیٰ) لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ۔

ان آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام کائنات کے اس اصول پر ہونے کا اصلی مقصد ہمارے نفوس کی اصلاح و تربیت ہے۔ چنانچہ کائنات کی حالت کے بالمقابل نفس کی حالت بیان کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مادی دنیا کو اللہ تعالیٰ نے تاریک اور روشن اور پست و بلند بنایا تاکہ نفس انسانی کیلئے ایک آئینہ ہو اور جو حقیقت اس کو الہام کی گئی ہے وہ اس مادی مثال سے اس کے اندر پوری طرح راسخ ہو جائے۔ اور اس کو ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی نشانیاں

مل جائیں پس پہلے دلائل آفاق بیان کئے، پھر بالکل ٹھیک اسی کے مطابق دلائل انفس کی طرف اشارہ فرمایا تاکہ ہم سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ خالق و حکیم اور مدبر ہے۔ اور پھر یہاں سے توحید و معاد کی معرفت کا دروازہ کھلے چنانچہ ایک مقام میں فرمایا:-

وَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ	اور ہم ان کو دکھاتے ہیں اپنی نشانیاں
وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ	آفاق میں اور ان کے نفوس کے اندر
لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔	تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہی حق ہے۔

پھر اس کے بعد نفس کی حالت اور اس کے الہام کا ذکر فرمایا جو درحقیقت حیات کی ایک نہایت واضح دلیل ہے کیونکہ اگر جزا نہیں ہے تو فجور و تقویٰ کیا معنی؟ فجور وہ چیز ہے جو فطرت کے مخالف ہو اور جس کا ارتکاب خدا کی نافرمانی کا باعث ہو اور تقویٰ نفس کی طہارت اور خدا ترسی کو کہتے ہیں۔ اس الہام سے مراد وہ بندگی اور ذمہ داری ہے جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ سورہ قیامہ کی تفسیر میں اس کے متعلق بعض اشارات گذر چکے ہیں۔ یہ الہام اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ہمارا خالق ایک ایسی ہستی ہے جو ہمارے اعمال کے مطابق ہم کو بدلہ دے گی۔ قیامت کے وقوع پر یہ ایک فطری شہادت ہے اور ہمارے نفس کے لئے اس شہادت سے بڑھکر کوئی شہادت نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ خود ہمارے

اندر سے بول رہی ہے لیکن جن کے کان اس عالم محسوسات کے ہنگاموں نے بہرے کر دیئے ہیں وہ اس شہادت سے بے خبر ہیں۔ اس وجہ سے قرآن نے متوجہ کرنے کے لئے پہلے عالم آفاق کی شہادتیں پیش کیں اور آفتاب و ماہتاب، روز و شب اور آسمان و زمین کا ذکر کیا۔ اس کے بعد تدریجاً عالم نفس کی بعض گواہیاں پیش کیں اور سب سے آخر میں ایک تاریخی شہادت پیش کی جو مخاطب کے نزدیک بالکل مسلم تھی گویا یہ شہادت کی ایک تیسری قسم ہے جو آفاقی و انفسی دونوں طرح کے دلائل کی جامع ہے۔ آگے ہم بالاجمال اس پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

معاد پر ایک تاریخی شہادت

۶ ۔ اہل عرب جن قوموں سے اچھی طرح واقف تھے انہی کے حالات کو اللہ تعالیٰ نے گواہی میں پیش کیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ "کذبت ثمود" کے الفاظ سے جیسا نہ ہندلا تصور ہمارے ذہن میں قائم ہوتا ہے ویسا ہی اہل مکہ کے ذہن میں بھی قائم ہوتا ہوگا؟ نہیں۔ اس سورہ کے چند مختصر لفظوں میں ثمود کے متعلق جو اشارات کئے گئے ہیں، وہ اہل عرب کے سامنے ثمود کی پوری تاریخ آئینہ کر دینے کے لئے بالکل کافی تھے۔ ثمود عرب بائدہ میں سے ہیں جن کی بستیاں اور جن کے

چرچے اہل عرب نے وراثت میں پائے تھے۔ اور جن کے متعلق ان کی روزمرہ کی گفتگوؤں میں مختلف قسم کی مثلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن مجید ہمارے اس دعویٰ پر سب سے بڑی حجت ہے۔

(۱)	وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ	اور عاد اور ثمود اور تم کو ان کی بستیاں
	تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسَاكِنِهِمْ	معلوم ہیں۔
(۲)	اَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ	بیشک ہم نے انکو اور انکی پوری قوم کو
	اَجْمَعِيْنَ. فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ	تباہ کر دیا پس ان کے ڈھے ہوئے مکانات
	خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ	ہیں ان کے ظلم کے باعث بے شک
	فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ	ان میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے
	يَّعْلَمُوْنَ	جو علم رکھتے ہیں۔
(۳)	وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسَاكِنِ	اور تم بسے ان لوگوں کے مکانوں میں
	الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ	جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور تم کو معلوم
	وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا	ہے کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا معاملہ کیا اور
	بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ	ہم نے تمھارے لئے مثلیں بیان کیں۔

شعراء نے بھی ان کا ذکر اسی حیثیت سے کیا ہے۔ ابو زبید طائی کہتا ہے:-

من رجال کانوا جما لا انجوما   فھم الیوم صحب ال ثمود

ثمود عاد کے بقایا میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض شعرا کبھی کبھی ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ دونوں قوموں کو ایک کر دیتے ہیں۔ آگے زہیر بن ابی سلمیٰ کا ایک شعر اس مطلب کا ملے گا۔ یہ لوگ اپنی قوت و صولت میں ضرب المثل تھے۔ خنساء نے کہا ہے

ولاقاہ من الایام یوم   کما من قبل لم یخلد قدار

اور اسکو گردش روزگار نے فنا کر دیا جس طرح اس سے پہلے قدار کو دوام نہیں حاصل ہوا

شعر میں قدار سے مراد احمر ثمود ہے جس نے اونٹنی کو گزند پہنچایا تھا۔ جس طرح عاد میں قیل بن عمر گذرا ہے۔ اسی طرح قوم ثمود کا یہ نہایت سرکش اور مطلق العنان سردار تھا۔ مشہور جاہلی شاعر افوہ اودی نے ایک قصیدہ میں اپنی قوم کے پاجیوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کو قیل و قدار سے تشبیہ دی ہے۔

فینا معاشر لم یبنوا لقومھم   وان بنی قومھم ما افسدوا عادوا

ہم میں کچھ ایسے اشرار ہیں جنھوں نے اپنی قوم کیلئے کچھ بنایا نہیں اور اگر انکے بگاڑے ہوئے کو قوم نے بنایا تو انھوں نے اسکو پھر بگاڑ دیا

لا یرشدون ولن یرعوا لمرشدھم   والجھل منھم معا والغی میعاد

نہ خود راہ دکھاتے اور نہ راہ دکھانیوالوں کی سنتے، جہالت اور سرکشی دونوں ان میں ساتھ ساتھ ہیں

اضحوا کقیل بن عمر فی عشیرتہ ۔۔۔ اذا اھلکت بالذی سدی لہا عاد

انکا حال وہی ہے جو قیل بن عمر کا اپنی قوم کے اندر تھا کہ اسکی کرتوت کی بدولت عاد ہلاک ہوئے۔

او بعدہ کقدار حین تابعہ ۔۔۔ علی الغوایۃ اقوام فقد بادوا

یا اس کے بعد قدار کا جس کی لوگوں نے گمراہی میں پیروی کی اور ہلاک ہوئے۔

واقعات کی شہادت چونکہ محسوس ہوتی ہے اور ان کی تفصیلات تواتر کے ساتھ آدمی سنتا ہے اس لئے قدرتی طور پر طبیعتیں ان سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ پھر اپنے نفس پر خواہشوں کے اتنے پردے ہوتے ہیں کہ اپنے اعمال کی برائی اس کو نظر نہیں آتی۔ لیکن برائی سے نفرت ایک فطری بات ہے اس لئے دوسروں کے حالات سے وہ عبرت حاصل کرتا ہے۔

ہم نے ان شہادتوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ آفاقی و انفسی دونوں طرح کے دلائل کی جامع ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نفوس کے ساتھ اعمال کے مطابق جزا دینے کا جو معاملہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان شہادتوں کے اندر ان کا ہر پہلو موجود ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مخفی الہام فرمایا اسکے بعد جھڑکی اور دھمکی دیکر ہوشیار کیا پھر اپنی اس جھڑکی اور دھمکی کے آثار و نتائج یعنی ان کی ڈھئی ہوئی بستیوں کو بعد میں آنے والوں کے لئے سرمایہ عبرت بنا کر محفوظ کر دیا کہ وہ دیکھ سکیں کہ

ان کے اگلوں کے ساتھ ان کی شرارت پر کیا معاملہ ہوا۔ پس ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھکر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر آفاقی و انفسی دونوں طرح کی دلیلیں جمع ہوگئی ہیں۔

قریش اور ثمود

۷۔ دوسری فصل میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کے لئے ایک عام انذار و تخویف ہے اور روئے سخن خصوصیت کے ساتھ ابولہب کی طرف ہے۔ اب تھوڑی دیر توقف کرکے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ قریش اور ثمود میں مناسبت کیا ہے؟

یہ معلوم ہے کہ قریش تمام عرب کے سردار تھے اور ان کے منصب کی عظمت اور انکی عام ذہنی بلندی نے پورے ملک میں ان کو ایک نہایت نمایاں تفوق اور برتری کی جگہ دیدی تھی اور عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی حیثیت کسی زمانہ میں ثمود کو بھی حاصل تھی، ثمود عاد کے بقایا میں سے ہیں اور ان کی تمدنی اور صنعتی برتری اس درجہ مسلم تھی کہ عرب ان کے تمدنی آثار کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ خود قرآن مجید ان کا ذکر ایسے انداز سے کرتا ہے جس سے ہمارے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ	اور ہم نے ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو
تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسَاكِنِهِمْ	اور تم کو ان کی بستیاں معلوم ہیں اور
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ	شیطان نے انکی نگاہوں میں ان کے
أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ	عملوں کو اچھا کر دکھایا تھا پس روک دیا
عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا	ان کو اللہ کے راستہ سے حالانکہ وہ
مُسْتَبْصِرِيْنَ	بڑے کارداں تھے۔

سورہ فجر کی تفسیر میں ہم ان کی تمدنی ترقیوں کے بعض دلائل کلام عرب کی تائیدات کے ساتھ نقل کر آئے ہیں، جو مناسبت قریش اور ثمود میں ہے۔ اس سے زیادہ گہری مناسبت ان دونوں قوموں کے سرداروں میں ہے۔ قریش کے ابولہب اور ثمود کے قدار کے حالات پر غور کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ بالکل ایک ہی چیز دو بھیسوں میں دو جگہ نمودار ہو گئی ہے۔ یہ دونوں بدبخت ترین خلائق تھے۔ دونوں اپنی اپنی قوموں کے سردار تھے اور بالآخر دونوں نے اپنی جماعتوں کو ہلاکت کے گڑھے میں گرایا۔

عرب میں سیادت و قیادت کی تمام عظمت خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ تھی۔ اسکی تولیت ابوطالب کے بعد ابولہب کو منتقل ہوئی۔ اور اس طرح تمام عرب

کی قیادت کی باگ اس کے قبضہ میں آئی۔ اس نے بیت اللہ پر قبضہ کرنے کے بعد
اس کے بنیادی مقاصد، دعوت توحید اور ہمدردی فقراء وضعفاء، یکقلم برباد کر دیئے۔
یتیموں کو دھکے دینے لگا، مسکینوں کو دھتکارنے لگا۔ نماز اور ذکر الٰہی، جس سے
اس گھر کی اصلی رونق و آبادی تھی ختم کر ڈالی۔ اور سرکشوں اور نافرمانوں کے جتھہ
کا سردار بن بیٹھا۔

پھر جب اسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم نے اسکی بدعات و شرارتوں کے خلاف
آواز اٹھائی ہے تو اس کو اپنی سرداری کے زوال کا خطرہ محسوس ہوا۔ اور بجائے اسکے
کہ اپنی اصلاح کرتا، اس نے آنحضرت صلعم سے جنگ و پرخاش شروع کر دی اور
قریش کے تمام سرکشوں کو آپ کی عداوت پر متحد کر لیا۔ سورہ لہب اور سورہ
ماعون کی تفسیر میں ہم اسکی بعض خصوصیات بیان کر چکے ہیں۔ یہاں زیادہ تفصیل
کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گوناگوں مناسبتیں تھیں جنکی وجہ سے قرآن نے ثمود اور انکے
سردار قدار کو، قریش اور ان کے سردار ابولہب کے سامنے بطور مثال اور نمونہ عبرت
کے پیش کیا، تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ جو راہ وہ چل رہے ہیں وہ بعینہ وہی راہ ہے
جو ان سے پہلے دوسری گمراہ قومیں چل چکی ہیں اور جس کا انجام بالآخر تباہی ہے
اسی مقصد سے قرآن نے امم سابقہ میں سے اور بہت سی قوموں کے حالات

قریش کو سنائے ہیں تاکہ وہ ان حالات کے اندر خود اپنے حالات و انجام کو دیکھ لیں اور اسی کے ساتھ ان کو یہ بات بھی بتا دی گئی کہ اب وہ خدا کے عذاب کے پوری طرح مستحق ہو چکے ہیں لیکن نبیؐ اور مومنین کے ایمان کی برکت کی وجہ سے ابھی وہ اسکی زد سے محفوظ ہیں۔ جس روز یہ امان اٹھ جائے گی، یعنی پیغمبر اپنی جماعت کے ساتھ ان کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جائے گا، عذاب الٰہی آ دھمکے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ	اور اللہ کو زیبا نہ تھا کہ وہ ان کو عذاب
وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ	دیتا درانحالیکہ تم ان کے اندر موجود تھے
اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ	اور نہیں تھا اللہ ان کو عذاب دینے والا
يَسْتَغْفِرُوْنَ	درانحالیکہ وہ اپنے گناہوں کی معافی
. . . .	چاہتے ہوں۔

پس امت کے اندر سے ایک جماعت کا استغفار بھی عذاب کو دفع کرتا رہتا ہے۔ اور جب تک یہ جماعت اعلان برأت کر کے علیٰحدہ نہ ہو جائے، اس کی برکت پوری قوم پر سایہ افگن رہتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجادلہ کا جو واقعہ قرآن نے سنایا ہے اس سے اس دعوی کا ثبوت ملتا ہے بالکل یہی صورت حالات قریش کے معاملہ میں بھی تھی۔ قریش عذاب کے مستحق ہو چکے تھے لیکن پیغمبرؐ اور

مومنین کی موجودگی نیز بیت اللہ کی برکت اور مکہ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مانع عذاب تھی۔ یہاں تک کہ مومنین مکہ سے ہجرت کر گئے اور پیغمبر کی امان اٹھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین مطہر کو سرکشوں اور نافرمانوں سے پاک کر دیا اور مومنین کے لیے ہجرت کے بعد "فرقان" کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا کیا اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ بیت اللہ کی حرمت کو کوئی بٹہ نہیں لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے متعلق جو دعا فرمائی تھی وہ ہر حال میں مستجاب رہی۔ اس معاملہ کے بعض پہلوؤں کی تفصیل تفسیر سورۃ الفیل اور تفسیر سورۃ الکافرون میں ملے گی۔

ایک لطیف اشارہ

۸۔ ثمود کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کو صرف جھٹلانے پر بس نہیں کیا۔ ناقہ کو کاٹ ڈالنے کے بعد، انھوں نے پیغمبر کو قتل کرنے کا بھی ارادہ کیا۔

قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللّٰهِ	انھوں نے کہا آؤ آپس میں خدا کی
لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ	قسم کھاؤ کہ ہم ضرور رات کے وقت صالح
لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا	اور اس کے گھر والوں پر چھاپا ماریں گے

مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۔	پھر ہم اس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ
وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا	اسکے اہل کے مارے جانے کے وقت
مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔	تو ہم موجود ہی نہ تھے اور ہم بالکل سچے
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	ہیں اور وہ ایک داؤ چلے اور ہم بھی
مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ	ایک داؤ چلے اور ان کو کچھ خبر نہ تھی پس
وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝	دیکھو ان کے داؤ کا انجام کیسا ہوا۔ ہم نے
(النمل)	ان کو اور انکی قوم سب کو ہلاک کر مارا

اسی کے ساتھ دیکھو قریش نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ	اور یاد کرو جب کافر تم پر داؤ چلا رہے
كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ	تھے کہ تم کو قید کرلیں یا قتل کر ڈالیں
اَوْ يُخْرِجُوْكَ ط وَيَمْكُرُوْنَ	یا جلاوطن کر دیں اور وہ اپنا داؤ کر رہے
وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ	تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ
الْمٰكِرِيْنَ (الانفال)	بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

یہ دونوں واقعات کس قدر مشابہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، ایک ہی واقعہ
دو طرح تعبیر کر دیا گیا ہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ قریش کے معاملہ کی اٹھان

بالکل ثمود کے معاملہ کے انداز پر تھی اسلئے معلوم ہو گیا کہ ان کی سرکشی بالآخر کس نتیجہ تک منتہی ہو گی۔ پس اللہ تعالےٰ نے ثمود کے حالات کی ایک تصویر ان کے سامنے رکھ دی تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جس طرح ثمود نے حضرت صالح کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا اسی طرح قریش بھی اپنے پیغمبر کو قتل کرنے کی سازشیں کریں گے اور جس طرح ثمود اپنی ان شرارتوں کی پاداش میں ہلاک ہوئے اسی طرح بالآخر قریش بھی پارہ پارہ کر دیئے جائیں گے۔ ثمود نے اونٹنی کو قتل کر کے چاہا کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے، ان کا خیال تھا کہ اگر صالح کی بات سچی ہے تو عذاب ضرور آئے گا اور اگر عذاب نہ آیا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب صالح کی زبانی دھمکیاں ہیں اور پھر ہم اس کو بے دریغ تہ تیغ کر دیں گے۔ لیکن خدا نے ان کو مہلت نہ دی، قبل اس کے کہ وہ اونٹنی کے قتل کے بعد پیغمبر کے قتل کا ارادہ کریں، عذاب الٰہی نے نمودار ہو کر ان کی ساری سازشیں درہم برہم کر دیں۔

پس یہ واقعہ یہاں اس لئے سنایا گیا کہ قریش اپنے آغاز و انجام کی پوری حکایت پہلے سے سن رکھیں اور اگر اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیں تو عبرت حاصل کر لیں اور قرآن نے، جیسا کہ اس کا طریقہ ہے واقعہ کی پوری تفصیل نہیں بیان کی ہے۔ بلکہ جس طرح عبرت و موعظت کے واقعات وہ بیان کرتا ہے اسی طرح اسکی

بعض اہم جزئیات کی طرف اشارہ کر دیئے ہیں۔ هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ۔

لیکن پڑھنے والوں کو انہی اشارات کی مدد سے ذہن میں پوری تصویر تیار کر لینی چاہیے۔ اور جو لوگ اس طرح ثمود کے واقعہ پر غور کریں گے وہ بے تکلف اس نتیجہ تک پہنچ جائیں گے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں یعنی اس میں قریش کے عزائم واعمال اور ان کے احوال ونتائج کی طرف نہایت لطیف تعریضات ہیں۔

اس طرح کے اجمالی اشارات کسی واقعہ کے متعلق اس کے ظہور سے پہلے اس لئے کر دیئے جاتے ہیں کہ جب وہ واقعہ ظہور میں آئے تو یہ علمی پیشینگوئیاں مومنین و منکرین دونوں کے اندر اس امر کا یقین پیدا کریں کہ اللہ کے وعدے بالکل سچے ہیں اور وہ ضرور پورے ہوں گے۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں، تنبیہات و بشارات کے سلسلہ میں اس نکتہ کی طرف اشارات کر دیئے گئے ہیں۔

ایک اشارہ امت مرحومہ کے باب میں

۹- اگرچہ ہماری اس کتاب کا مقصد اشارات و لطائف کی جستجو نہیں ہے لیکن ایک ایسی بات کا ذکر انشاء اللہ ناموزوں نہ ہوگا جو سرکشی اور نفس کی مطلق انسانی کے انجام کو ہمارے سامنے کردے کیونکہ یہ چیز اس درجہ اہم ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے امت مرحومہ کو کبھی ہلاک نہیں فرمایا لیکن اسی چیز کی بدولت وہ بارہا ہلاکت کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں پچھلی قوموں کے جو واقعات اور مثلیں بیان کی ہیں ان سے سبق حاصل کرنا اصلی علم ہے۔

انبیاء کے صحیفوں اور قرآن میں یہود کی سب سے بڑی شرارت یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے انبیاء و صلحاء کو قتل کیا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ	اور ماردی گئی ان پر ذلت اور مسکنت
وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ	اور وہ لوٹے اللہ کا غضب لیکر۔ یہ اس وجہ
مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ	کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور
كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ	نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس وجہ
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ	سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور

الحق ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا — اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔
وَّكَانُوا يَعْتَدُوْنَ

یعنی انھوں نے سرکشی اور عدوان کی وجہ سے انبیاء کو قتل کیا۔

سورہ بقرہ ہی میں دوسری جگہ ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ	کیا جب جب تمھارے پاس کوئی رسول
بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ	تمھاری خواہشوں کے خلاف کوئی حکم لیکر
اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا	آیا تم اکڑ بیٹھے، پھر بعض کو تم نے جھٹلایا
كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ	اور بعض کو قتل کرتے رہے اور کہتے
وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط	ہیں ہمارے دل محفوظ ہیں بلکہ اللہ نے
بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ	ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت
فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ	کردی ہے پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

یعنی ان کے کفر اور استکبار کی وجہ سے جس نے ان کو انبیاء کی تکذیب اور قتل پر آمادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر گمراہی کی لعنت کردی۔

یہی مضمون سورہ آل عمران میں وارد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ	بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار

بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ	کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل
النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ	کرتے ہیں اور ان کو قتل کرتے ہیں
یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ	جو لوگوں میں سے عدل کا حکم دیتے
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ	ہیں تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری
فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ	پہنچا دو وہی ہیں کہ جن کے اعمال
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ	دنیا و آخرت میں ڈھ گئے اور انکا
اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَ	کوئی مددگار نہیں ہے۔۔۔۔
الْاٰخِرَۃِ وَمَا لَھُمْ مِّنْ	. . . .
نّٰصِرِیْنَ	. . . .

اس آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ فرمادیا ہے کہ صلحاء اور عدل و قسط کا حکم دینے والوں کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے، چنانچہ اس کا ذکر انبیاء کے قتل کے ذکر کے بعد فرمایا۔ اسکی وجہ ظاہر ہے کہ اس معصیت کا محرک درحقیقت وہ عصیان و عدوان ہے جو انبیاء کے قتل کا باعث ہوا اور جس کا ذکر اس باب کی اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ اللہ تعالےٰ

کا قانون ہے کہ چند افراد و اشخاص کے کسی جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ پوری قوم پر اپنا غضب نہیں نازل کرتا مگر اس وقت جبکہ ان کے ہاتھوں سے عدل و قسط کا کوئی بنیادی قانون ڈھ رہا ہو اور دوسرے خاموشی سے ان مجرمانہ اعمال کا تماشہ دیکھیں اور مجرموں کا ہاتھ نہ پکڑیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل و قسط کا قیام اس پورے نظام کائنات کے بقا و قیام کے لئے ناگزیر ہے۔ پس ضروری ہے کہ جب اسکو کوئی صدمہ پہنچے تو سب اس کے لئے دردمند اور بےچین ہوں اور اللہ تعالیٰ کے قانون کی حفاظت کے لئے جوش اور غضب سے بھر جائیں، جو ایسا نہ کریں گے وہ درحقیقت مجرموں کے شریک حال اور معاون متصور ہوں گے۔ اسی بنیاد پر قرآن نے ان لوگوں کو نہایت سخت الفاظ میں ملامت کی ہے جو جنگ و جہاد کے مواقع پر گھروں میں بیٹھے رہے اور حمایت حق و عدل کے جوش نے ان کو بےچین نہیں کیا۔ قرآن نے جہاں امت کو اللہ و رسول کی کامل اطاعت کا حکم دیا ہے وہاں اس امر کی تصریح کر دی ہے۔ سورہ انفال میں ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا	اے ایمان والو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا
اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ	(وللرسول میں واو بیان کیلئے ہے
اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ	کیونکہ رسول اللہ ہی کی اطاعت کی طرف بلاتا ہے) جبکہ

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ
بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ وَاتَّقُوْا
فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَ
اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ
قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى
الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ
يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ
وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ
رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ
يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

وہ تم کو بلاتا ہے ایسی چیز کیلیے جو تم کو زندگی
بخشے گی اور یاد رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے
دل کے بیچ میں حائل ہو جاتا ہے (یعنی
آدمی کے دل کے بھیدوں کو قبل اسکے کہ
آدمی خود انکا احساس کرے اللہ تعالیٰ
جان لیتا ہے) اور اسی کے پاس تم جمع کئے
جاؤ گے (پس جو کچھ تم نے چھپا رکھا ہے اور
جو کچھ ظاہر کیا ہے سب کا حساب ہوگا کیونکہ
وہ تمھارے ظاہر و باطن سے باخبر ہے) اور
اس فتنہ سے بچو جو خاص انہی لوگوں کو
نہیں پہنچے گا جھنوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے
(یعنی صرف وہی لوگ ماخوذ عذاب ہونگے
جھنوں نے پیغمبر کی نافرمانی کی ہے کیونکہ بقیہ
لوگوں پر یہ فرض تھا کہ وہ نافرمانوں کو
روکتے اور پیغمبر کے ساتھ ہمدردی کرتے)

وَتَخُونُوٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	اور یاد رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے
....	اور یاد کرو جب تم زمین میں تھوڑے
....	اور کمزور تھے۔ ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اُچک
....	لیجائیں۔ پس اللہ نے تم کو پناہ دی اور
....	اپنی مدد سے تمھاری تائید کی اور تم کو پاک
....	روزی دی تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اے ایمان
....	والو اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور
....	نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم جانتے ہو۔

ان آیات میں صاف بیان فرمادیا کہ اگر کسی قوم کے چند افراد کسی جماعتی معصیت کا ارتکاب کریں اور باقی سب خاموش رہیں، ان کے ہاتھ نہ پکڑیں، تو ان کے جرم کی پاداش میں پوری قوم ماخوذ ہوگی۔ کیونکہ انھوں نے حق و عدل کو، جو سب کی متاع مشترک تھا، تنہا چھوڑ دیا۔ ثمود کے واقعہ کی بالکل یہی نوعیت تھی اور یہی سبب ہے کہ ان کے اندر سے ایک بدبخت نے جو کچھ کیا اس کے وبال میں پوری قوم گرفتار ہوئی۔ چنانچہ دیکھو قرآن نے اس ایک شخص کے فعل کے لئے

"عقروها" کا لفظ استعمال کیا، یعنی جمع کا صیغہ اور اونٹنی کے کاٹ ڈالنے کے جرم کو پوری قوم کی طرف منسوب کیا کیونکہ قوم نے اس جرم پر خاموشی اختیار کر کے درحقیقت اپنی پسندیدگی اور رضا کا اظہار کر دیا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ بات عقلاً بھی بالکل صحیح ہے کیونکہ گناہ درحقیقت قلب کی ایک صفت ہے، ظاہری اعمال و افعال تو محض اس کے آثار ہیں۔ پس اگر کوئی شخص کسی گناہ پر خوش ہے اور اس کو اچھا سمجھ رہا ہے تو یقیناً وہ اس شخص کے برابر ہے جس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا بہت سے اعمال و افعال یہود کی طرف ایسے منسوب کئے ہیں جن کی اصلی ذمہ داری ان کے آباء و اجداد پر عائد ہوتی تھی لیکن چونکہ اخلاف نے بھی ان افعال کو پسند کیا اس لئے جائز ہوا کہ وہ ان کی طرف منسوب کئے جائیں۔ باپوں کے جرم میں بیٹے جو پکڑے جاتے ہیں تو اس میں بھی یہی راز ہے اور اسمیں ایک اور دقیق نکتہ بھی ہے جس کو ہم نے سورہ نوح کی تفسیر میں بیان کیا ہے اور وہ اسکے مہمات مطالب میں سے ہے۔

قوموں کے مواخذہ کا قانون

۱۔ کوئی قوم جب نافرمانی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً تباہ نہیں کر دیتا

اس کے بہت سے گناہوں سے درگذر کرتا ہے، اور مہلت دیتا ہے تاکہ جو توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کرلیں اور جو ہلاک ہونا چاہیں وہ پورے طور پر عذاب کے مستحق ہو جائیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ	اور اللہ لوگوں سے ان کے ظلم پر فوراً
بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا	مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی جاندار
مِنْ دَابَّةٍ وَلٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ	کو زندہ نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو مہلت
إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى	دیتا ہے ایک مدت متعینہ تک۔

چنانچہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں پر بار بار سزا تو دی لیکن ....

..... جب تک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زعم کے مطابق انھوں نے قتل کر کے اپنا پیمانہ لبریز نہیں کرلیا، اس وقت تک اللہ تعالےٰ نے نہ تو اپنی شریعت ان سے چھینی اور نہ ان سے اپنا رشتہ کاٹا۔ البتہ جب انھوں نے، اپنے خیال کے مطابق، اس تیسرے خون کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تو وقت آگیا کہ خدا کا عذاب ان کو تباہ کر دے۔ اس تمہید کے بعد دو اہم باتوں کا خاص طور پر خیال رکھو۔

(۱) قرآن مجید سے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کے برے اعمال کے نتائج فوراً نہیں ظاہر فرماتا بلکہ اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے کہ لوگوں کو مہلت دے

یہاں تک کہ وہ عذاب کے پوری طرح مستحق ہو جائیں۔

(۲) نویں فصل میں ہم نے بتایا ہے کہ انبیاء، صلحاء اور عدل و قسط کی دعوت دینے والوں کا قتل شدید ترین معصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑھکر کوئی جرم نہیں۔

اب ہم گذشتہ امتوں میں سے ایک امت اور اس امت مرحومہ کی تاریخ کے چند واقعات کی روشنی میں بعض ایسے نتائج و احوال کی طرف رہنمائی کریں گے جو ماضی میں واقع ہو چکے ہیں اور ضرور ہے کہ آئندہ بھی واقع ہوں۔ اور یہ چیز منجملہ اس سنت الٰہیہ کے ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں وارد ہے کہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ اور اس سے مراد سرکشوں اور مفسدوں کی گرفت کا وہ قانون ہے جو اٹل ہے اور ہمیشہ بے لاگ ظہور میں آتا ہے، کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا۔

امت مرحومہ میں ناقۃ اللہ کی مثال

۱۱۔ ثمود نے اللہ کی اونٹنی کو قتل کر کے سرکشی کی جو مثال مشوم قائم کی تھی یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کر کے بعینہ اس مثال کی تقلید کی گویا یہود کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود گرامی ناقۃ اللہ کی مثال تھا۔ یہ مثال محض ہماری طبع زاد

نہیں ہے۔ قرآنی اشارات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ناقہ کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ایک آیۃ اللہ تھی، بعینہ یہی بات قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ملتی ہے۔ سورہ انبیاء میں ان کی نسبت وارد ہے۔ وجعلناھا وابنھا اٰیۃ للعٰلمین اور ہم نے اس کو (مریم) اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو دنیا والوں کے لئے نشانی بنایا۔ یعنی ان کا وجود خود ایک آیت تھا۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں یہود ثمود کی طرح پامال کر دیئے گئے اور نعمت نبوت ان سے چھین لی گئی۔

بعینہ اس کے مشابہ واقعہ امت مرحومہ میں پیش آیا۔ اس امت کے اندر ناقہ کی مثال حضرت علیؓ تھے، چنانچہ ان کے قتل کے بعد اس امت سے خلافت چھین لی گئی اور خلفاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کے بعد جو لوگ مسند خلافت پر متمکن ہوئے وہ خلفاء نہ تھے، ملوک و سلاطین تھے (الا ماشاء اللہ) جو مال و جائداد کی طرح باشاہت کو وراثت میں پاتے تھے اور بادشاہوں کی طرح فرمانروائی کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اس انقلاب کی پیشگوئی فرما دی تھی۔ اور اس دور کو "ملک عضوض" کے لفظ سے تعبیر فرمایا تھا۔ بعض روایات میں ان تمام امور کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا :-

"اے ابوتراب (علیؓ) کیا میں تمھیں بدبخت ترین خلایق احمر ثمود کی خبر نہ دوں جس نے ناقہ کو قتل کیا اور جو تم کو اس پر (سر پر) مارے گا اور اس سے یہ (ڈاڑھی) تر ہو جائے گی"۔

۱۲- حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی مثالیں

تم کہو گے کہ حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمانؓ نہایت مظلومیت اور بیکسی کی حالت میں قتل ہوئے، جن کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا، حضرت فاروق اعظمؓ شہید ہوئے، جن کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ سب سے آخر میں حضرت امام حسینؓ قتل ہوئے، جن کی مظلومیت تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ پھر ہم نے ان میں سے کسی کے واقعہ کو حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ سے کیوں نہیں تشبیہ دی؟ اس کے لئے حضرت علیؓ ہی کے واقعہ کو کیوں انتخاب کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ ایک مخصوص نوعیت رکھتا ہے۔ آپ کے قتل کی ذمہ داری اس امت پر نہیں ہے۔ آپ کو ایک عیسائی نے شہید کیا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا کہ آپ کا قاتل

ہاں نصرانی سے تو نہایت خوش ہوئے کہ امت آپ کے قتل کے وبال سے بچ گئی۔ حضرت [illegible] مقتول ہوئے سے اور اس جرم سے راضی تھے اور چونکہ یہ پہلا خون تھا اس لیے قانون الٰہی نے امہال سے کام لیا۔ پس حضرت عمرؓ حضرت زکریاؑ سے زیادہ اشبہ نظر آتے ہیں۔ جس طرح وہ قربان گاہ اور مسجد کے درمیان قتل ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ بھی نماز کے اندر شہید ہوئے۔ اسی لیے حضرت کعب نے فرمایا کہ ”حضرت عمرؓ کا حلیہ تورات میں موجود ہے“۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ کی بہت سی صفتیں تورات میں بیان ہوئی ہیں۔ آیت ”ذٰلک مثلهم فی التوراة ومثلهم فی الانجیل“۔ کی تفسیر کے ذیل میں بعض ضروری باتیں ملیں گی۔

حضرت عثمانؓ کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حالت سے زیادہ اشبہ ہے۔ جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام قید کی حالت میں قتل کیے گئے اسی طرح حضرت عثمانؓ مکان کے اندر بند کر کے شہید کیے گئے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ سے جو مشابہت حضرت علیؓ کے واقعہ کو ہے، وہ کسی دوسرے واقعہ کو نہیں ہے۔ نتائج کے اعتبار سے بھی دونوں بالکل یکساں درجہ کی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ

کر کے خدا کی امانت سے محروم ہو گئے۔ اور مسلمان حضرت علیؓ کے قتل کی ذمہ داری لے کر خلافت مقدسہ سے محروم ہو گئے۔

باقی رہا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا معاملہ، تو یہ تو ملت مرحومہ کے سینہ کا وہ زخم ہے، جو ہمیشہ تازہ رہے گا اور تاریخ کبھی اس کو فراموش نہ کر سکے گی۔ اور درحقیقت اسی بدبختی کا ایک مظہر ہے، جو حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ زہیر نے جنگ کے نتائج کو احمر عاد سے تشبیہ دی ہے۔ اور کیا خوب بات کہی ہے:-

فتنتج لکم غلمان اشام کلھم کاحمر عاد ثم ترضع فتفطم

ایک برائی دس برائیوں کا دروازہ کھولتی ہے۔ پس حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں جو شقاوت ظاہر ہوئی تھی کی پرورش و رضاعت سے وہ حادثہ ظہور میں آیا، جو حضرت امام حسینؓ کی مظلومانہ شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر اس واقعہ کی جڑ سے اس طرح کے ہزارہا فتنوں کی شاخیں پھوٹیں اور پھیلیں اور ان کے مسموم اور مہلک ثمرات نہ جانے کن کن صورتوں میں نمودار ہوئے۔ یہ مسلمانوں کے جان و مال کی اباحت کے جو ہولناک اور شرمناک واقعات بار بار پیش آئے، یہ سب اسی شجرہ ملعونہ فساد کے برگ و بار تھے۔

اور یہی فتنے تھے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۃ الوداع میں آگاہ فرمایا تھا۔

یا ایہا الناس انما المومنون	لوگو تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی
اخوۃ ولا یحل لامرئ مال	ہیں، کسی شخص کیلئے یہ بات جائز نہ ہوگی
اخیہ الا عن طیب نفس	کہ وہ اپنے بھائی کا مال لے سے مگر اسکی
منہ الا ھل بلغت اللھم	اجازت اور خوشی سے۔ آگاہ میں نے خدا کا
اشھد فلا ترجعن	پیغام پہنچا دیا۔ اے اللہ تو گواہ رہ۔ پس
بعدی کفارا یضرب	اے لوگو نہ ہو کہ تم میری بعد حالت کفر
بعضکم رقاب بعض	میں لوٹ جاؤ تم میں سے ایک دوسرے
. . . .	کی گردن مارنے لگے۔

قرآن مجید نے بھی باہمی جنگ وجدل کو عذاب الٰہی سے تعبیر فرمایا ہے۔

سورہ انعام میں ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ	کہہ دو کہ وہ قادر ہے اس بات پر کہ تم پر
یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ	عذاب بھیجے تمھارے اوپر سے یا تمھارے
فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ	قدموں کے نیچے سے یا تم کو گروہ در گروہ
اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ	کر کے تم کو باہم ٹکرا دے اور ایک کو

بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ — دوسرے کا عذاب چکھائے دیکھو ہم اپنی
كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ — آیتیں کس طرح پھیر پھیر کر بیان کرتے
لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ — ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔

چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ عذاب نمودار ہو گیا۔ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی جماعتوں میں ایسی خونریز جنگیں ہوئیں کہ مسلمان بالکل بے دم ہو کے رہ گئے اور جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کا عذاب دوسری جماعت کو چکھا دیا اور یہ آگ برابر مشتعل رہی۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اس کے بعد مسلمانوں پر جتنی آفتیں نازل ہوئیں وہ تمامتر انہی دونوں گروہوں یا اسی قبیل کی جماعتوں کے ہاتھوں نازل ہوئیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ گروہ بندی اور تفریق اس درجہ مبغوض تھی کہ اس نے اپنے پیغمبر کو اس سے بالکل بری قرار دیا تھا۔ چنانچہ فرمایا:۔ "ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیٔ۔ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا، اور گروہ گروہ بن گئے، تم کو ان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح ایک اور موقع پر بھی باہمی جنگ و جدل کو عذاب سے تعبیر فرمایا ہے "ومن الذین قالوا انا نصاریٰ اخذنا میثاقھم فنسوا

حظا مما ذکروا به فاغرینا بینهم العداوة والبغضاء الی یوم القیمة

اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں. ہم نے ان سے بھی
میثاق لیا. پس وہ بھول گئے ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ ان لوگوں
کو تذکیر کی گئی تھی. (یعنی کتاب الٰہی) پس ہم نے بھڑکا دی ان کے درمیان عداوت
اور بغض کی آگ قیامت تک کے لئے.

اس بحث کی اصلی جگہ سورہ حجرات ہے، اس لئے یہاں ان اشارات
پر ہم کفایت کرتے ہیں۔

سہ۔ سورہ کے ربط پر دوبارہ نظر

اس سورہ میں بدبختی اور شقاوت کے انجام کی تفصیل کی ہے. گویا پوری
سورہ "وقد خاب من دساها" کے اجمال کی تشریح ہے۔ اور "قد افلح
من زکٰها" جسمیں فلاح کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اس کا ذکر اس سورہ میں
مجمل چھوڑ دیا ہے. اس کی توضیح نہیں فرمائی۔ اس کی توضیح بعد کی سورہ (سورہ
الیل) میں کی ہے۔

ماسبق سورہ سے ربط کا پہلو یہ ہے کہ اس میں بتایا تھا کہ بیت اللہ کے

چند مقاصد ہیں۔ ایمان، صبر، مرحمۃ اور تواصیۂ حق و صبر۔ جو لوگ ان چیزوں کو اختیار کریں گے ان کے لئے کامیابی اور نصرت کی فتح یابیاں ہوں گی اور وہ اصحاب المیمنہ میں ہوں گے۔ اور جو ان سے اعراض کریں گے ان کے لئے بدبختی اور شقاوت کی لعنتیں ہوں گی اور وہ اصحاب المشئمہ میں ہوں گے۔ پس اس سورہ میں قریش کے لئے اس بدبختی اور شقاوت کی ایک مثال بیان کی، اور اس کیلئے قوم ثمود کے واقعہ کو بطور مثال کے اختیار فرمایا۔ اس پہلو سے یہ سورہ، سابق و لاحق دونوں سے مربوط ہو جاتی ہے اور اس کا موقع وہی ہے جو سورہ ماعون کا ہے، جیسا کہ اس کی تفسیر سے واضح ہوگا۔

لیکن اگر ان تمام سابق و لاحق تعلقات سے قطع نظر کر لیا جائے تب بھی یہ سورہ اپنے اندر ایک مستقل تعلیم و حکمت رکھتی ہے۔ یعنی اس میں سرکشی اور تکذیب کے نتائج پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دئے گئے ہیں۔ پس اگر تم اپنی نظر کو اسی سورہ کے مطالب تک محدود رکھو اور اس کے پیش و عقب تک نہ پھیل سکو جب بھی اس کی تعلیمات کم از کم سرکشی اور تکذیب کے داعیہ کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے تو بالکل کافی ہیں۔ ہاں اگر اس کو سابق و لاحق سے ملا کر دیکھو گے تو تم پر بعض نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔ تم کو اس بیماری کی جڑ اور

اس بدبختی کی اصل بنیاد کا سراغ لگ جائے گا یعنی یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان تمام مفاسد کی اصل درحقیقت قساوت قلب ہے۔ اس کے متعلق ہم نے سابق سورہ کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔ وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ جہالت، بخالت اور سرکشی وغیرہ، تمام برائیوں کا اصل سرچشمہ قساوت قلب ہی ہے

۱۴۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا کی تفسیر

قرآن مجید، جس طرح اگلے صحیفوں کا مصدق اور متمم ہے۔ اسی طرح وہ ان کے اختلافات کے باب میں حکم اور مہیمن ہے۔ اپنی یہ حیثیت قرآن مجید نے خود نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ایک جگہ توراۃ اور انجیل کے بیان کے بعد قرآن کا ذکر ان لفظوں میں آتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	اور ہم نے اتاری تم پر کتاب حق کے ساتھ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ	تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو اس کے
مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ	آگے (پہلے) ہے کتاب میں سے (یعنی
فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ	قدیم صحیفے) اور نگراں ہے اس پر پس
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ	فیصلہ کرو ان کے درمیان اس چیز کے

عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ — مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور

.... پیروی کروان کی خواہشوں کی (یعنی انکی

.... تحریفات کی) چھوڑ کر اس حق کو جو تمہارے

دوسرے مقام پر ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى — بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بیان

بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ — کرتا ہے بڑا حصہ ان باتوں کا جنمیں

هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ — وہ مختلف ہیں۔

قرآن مجید اپنے اس منصب کے لحاظ سے، جہاں اگلے صحیفوں کی بہت سی باتوں کی تصدیق کرتا ہے، وہیں ان کی بہت سی ایسی باتوں کی، جو یہود نے ان میں ملادی ہیں، اور جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے، نہایت ہی زور قوت کے ساتھ تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے: "ولقد خلقنا السمٰوت والارض وما بينهما فى ستة ايام" (اور ہم نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چند دنوں میں) یہاں تک تو بعینہٖ تورات کے بیان کی تصدیق تھی۔ پھر اس کے بعد فرمایا "وما مسنا من لغوب" (اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں محسوس ہوئی) یہ ٹکڑا قرآن مجید کے مہیمن اور حکم ہونے کی حیثیت کو

نمایاں کر رہا ہے۔ یعنی اس میں توراۃ باب پیدائش کے اس بیان کی تردید ہے جو یہود نے ملا دیا ہے کہ خداوند نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی باتیں کہتا چلا جاتا ہے اور انہی کے لپیٹ میں کوئی ایسی بات کہدیتا ہے جس سے کسی خاص خیال کی تردید یا کسی مخصوص غلط فہمی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔

اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد، زیر بحث مقام پر غور کرو

اللہ تعالیٰ کے متعلق جہاں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہاں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ان بہت سے کاموں پر، جو رحمت و نقمت کے اس سے صادر ہوتے ہیں، کبھی کبھی پچھتایا بھی کرتا ہے چنانچہ اسکی ایک دلچسپ مثال یہود کی عنایت سے توراۃ کی کتاب پیدائش ۶ میں بھی ہے۔

"اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا بُرے ہی ہوتے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔"

اسی طرح طوفان کے ذکر کے بعد ہے۔

"اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین

پرستش نہیں بھیجوں گا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے ماروں گا۔"

قرآن کی تعلیم اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے، حکمت و رحمت کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر وہ کسی قوم کو ہلاک کرتا ہو یا کسی قوم کو رفعت و ترقی بخشتا ہے تو ایسا بغیر کسی ضابطہ اور اصول کے نہیں کرتا اپنے اس قانون حکمت و رحمت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اپنے تمام کاموں کے لئے ازل سے ٹھہرالیا ہے۔ پس اس کے کسی کام میں نہ خوف و طمع کا شائبہ ہے اور نہ کمی اور بیشی کا اندیشہ۔ اور اس لئے وہ ندامت و شرمندگی اور رنج و پچھتاوے کے تمام احوال و عوارض سے بالکل منزہ اور ارفع ہے۔ یہی حقیقت ہے جو یہاں "ولا یخاف عقبٰھا" سے واضح ہو رہی ہے اور اس طرح کتنی حقیقتیں ہیں، جو قرآن کی برکت سے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر روشن فرما دی ہیں۔ حالانکہ دوسرے قرآن مجید کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے ان سے دور ہیں۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ما ھدانا الی الصراط المستقیم واعطانا من الذکر الحکیم۔

سلسلہ دائرہ حمیدیہ نمبر ۱۳

تفسیر سورۂ عبس

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبد الاحد اصلاحی

اصلاح پریس سرائے میر اعظم گڑھ میں چھپی

قیمت ۶ ر

فہرست مضامین

نمبر شمار | | صفحہ

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	سورہ کا عمود، موقع اور ماقبل سے تعلق	۳
۲	انبیاء کا خلق عظیم، ان کی عصمت اور ان کے مواقع عتاب	۴
۳	الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل	۱۰
۴	ان آیات کا موقع نزول اور واقعہ کی اصلی تصویر	۱۴
۵	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۲۴
۶	پہلی غلطی سے بڑی غلطی	۳۰
۷	ان آیات کا ربط آگے سے	۳۳
۸	الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل	۳۵
۹	ان آیات کا باہمی نظم اور پیش و عقب سے تعلق	۴۵
۱۰	الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل	۴۹
۱۱	اشیائے مذکورہ میں باہمی ترتیب و مناسبت	۵۵
۱۲	آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے	۶۰
۱۳	الفاظ اور جملوں کی تاویل	۶۴
۱۴	ایک لطیف نکتہ	۶۷
۱۵	پوری سورہ کے نظم پر ایک اجمالی نظر	۶۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَبَسَ وَتَوَلّٰی (۱) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (۲) وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی (۳) اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی (۴) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی (۵) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی (۶) وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی (۷) وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی (۸) وَهُوَ یَخْشٰی (۹) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی (۱۰)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا (۱) اس پر کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا (۲) اور تجھے کیا معلوم، شاید وہ سدھرنا چاہتا ہو (۳) یا دھیان کرنا چاہتا ہو تو اسے یاد لانا مفید ہوتا (۴) جو بے پروائی کرتا ہے (۵) اس کے تو، تو پیچھے پڑا ہے (۶) حالانکہ تجھ پر کچھ الزام نہیں اگر وہ پاکیزہ بننا نہیں چاہتا (۷) اور جو تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے (۸) ڈرتا ہوا (۹) اس سے تو تغافل کرتا ہے (۱۰)

۱۔ سورہ کا عمود، موقع اور ماقبل سے تعلق

یہ سورہ منذرات میں سے ہے۔ یعنی ان سورتوں میں سے جو قوم کیلئے تہدید و وعید کی سرزنش لیکر نازل ہوئی ہیں۔ ابتدائے بعثت کی اکثر سورتوں کا یہی حال ہے۔ البتہ ان کے اسلوب بیان مختلف ہو گئے ہیں مثلاً اسی سورہ میں انذار کا ایک نیا پہلو اختیار کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو انکار اور نافرمانی پر اڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر اسی مضمون سے متعلق آگے چلکر کچھ اور باتیں آگئی ہیں۔ مثلاً چند لفظوں میں ان کی ہٹ دھرمی پر زجرو توبیخ ہے، پھر ان کی ضد اور بے پروائی کی خرابیاں بیان ہوئی ہیں، پھر ان کے انجام کی تفصیل ہے اور آخر میں، مقابلہ کے اسلوب، پر ان لوگوں کا بھی ذکر آگیا ہے جنھوں نے، ان سے الگ ہو کر ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس اسلوب کے چند فوائد قابل ذکر ہیں۔ مثلاً

(۱) توضیح مطلب کے لئے مخالف پہلو کا ذکر مفید ہوتا ہے۔ وبضدها

تنبین الاشیاء۔

(۲) اس میں ترہیب کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایک جامع
اور موثر انداز کلام ہے۔

(۳) اس میں آنحضرت صلعم کو اشارہ ہے کہ آپ کی توجہ کے اصلی مستحق
مومنین ہیں۔ ان کا حق مقدم ہے۔

سابق سورہ سے اس کا ربط یوں ہے کہ اس کے خاتمہ کی آیت
"انما انت منذر من یخشاھا" تھی یعنی تمھاری نصیحتوں کو وہی قبول
کر سکتے ہیں جو قیامت سے ڈرتے ہیں۔ پس اس سورہ میں یہ بتا دیا کہ پیغمبر
ایسے لوگوں سے اصرار و لجاجت پر مامور نہیں ہے جو قیامت کے خوف
سے بے پروا ہو گئے ہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار دھرایا گیا ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم غایت رافت و شفقت کے سبب سے
یا فرط جوش تبلیغ و دعوت میں، کبھی کبھی اصرار و الحاح کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔

یہاں بھی وہی مضمون ہے، اور قرآن مجید نے تعلیم کو موثر اور دلنشین
بنانے کیلئے، نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کر لیا ہے
اور پیغمبر صلعم کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے

منصب کے شایان شان نہیں ہے۔ اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تنبیہ و عتاب کا ہے لیکن درحقیقت ان تمام مواقع میں، جہاں آنحضرت صلعم کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے، غصہ و عتاب کا اصلی رخ پیغمبر صلعم کے بجائے منکرین کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ اتمام دعوت کا ایک نہایت معروف اسلوب ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہیں۔

سورہ کی یہ تاویل جو بالاجمال اوپر بیان ہوئی بالکل واضح ہے اور کسی صاحب بصیرت کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی لیکن بعض مفسرین سے اس کی تاویل میں لغزش ہو گئی ہے جس کو ہم آگے بیان کریں گے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایک فصل میں انبیاء کے خلق عظیم پر روشنی ڈالیں اور یہ واضح کر دیں کہ کبھی کبھی جو ان کو باندازِ عتاب مخاطب کیا جاتا ہے، تو اس عتاب کا اصلی پہلو کیا ہوتا ہے۔

انبیاء کا خلق عظیم، انکی عصمت اور ان کے مواقع عتاب

(۲) عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فرض رسالت کی ادائیگی کے لیے انہی لوگوں کو چنا جو اس کی

مخلوق میں اخلاق وتقویٰ کے نقطۂ کمال پر تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے "واللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کن پر ڈالے اور حضرت سرور کائنات صلعم کی نسبت فرمایا کہ "وانک لعلی خلق عظیم" بیشک تم ایک خلق عظیم پر ہو۔ اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپ کا انتخاب فرض رسالت کی ذمہ داریوں کیلئے عمل میں آیا۔

اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو اپنے امر ونہی سے مطلع فرماتا ہے، اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے ہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لحہ اس کے اشاروں پر چلتے، اور اس کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے "فانک باعیننا" بیشک تو ہماری نگاہوں میں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ	پس وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا
یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ	ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انھوں نے اپنے
رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ	رب کے پیغام پہنچا دیئے اور ان کے

اَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ — سارے معاملات اس کے

وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ — احاطہ میں ہیں اور اس نے

اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا — ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالم غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی ہے
ان کو لغزش سے بچاتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کسی غلط راہ میں قدم رکھتے ہیں۔
خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کیلئے نمودار ہو جاتا ہے اور کبھی وہ کسی پرخطر راہ میں
نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کیلئے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے
کہ وہ اپنے فرض نبوت اور منصب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو
ادا کر لیں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی
اور یہ بھی اس لئے کہ ایسا ہونا سنت الٰہیہ اور قانون حکمت کا اقتضا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے آزمائش کا قانون رکھا ہے۔ اور یہی
قانون ان کے باطن کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم
کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے، وہ فوراً اسکو
متنبہ کر دیتا ہے، اور اگر وہ پورے جوش و انہماک میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے

تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ باندازِ عتاب روکا جاتا ہے۔
تاکہ جس چیز سے منع کیا جارہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے واضح
ہو جائے۔ پیغمبر اس وقت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھکر
خیال کرتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے نمودار ہو کر رہنمائی نہ کردی
ہوتی تو وہ تو بالکل منزلہ قدم کے قریب پہنچ چکا تھا! یہ چیز اس کے شکر و
وانابت کے جذبہ میں ایک جوش پیدا کرتی ہے اور وہ تذلل و خضوع کی تمام
نیازمندیوں کے ساتھ اپنے پروردگار کے سامنے گر پڑتا ہے اور اس سے
قریب تر ہو جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح بچہ ماں کے ڈرا دینے کے
بعد اس کے سینے سے اور چمٹ جاتا ہے۔

الغرض پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی ہی کی طرف ہوتا ہے۔
اس کا دل ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس کا ہر
قدم مرضاتِ الٰہی کی راہ میں اٹھتا ہے۔ البتہ اسی میں کبھی کبھی افراط کی حالت
اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حق و اعتدال کی بیچ راہ پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے
کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کیلئے نمونہ ہوتا ہے۔ اسکی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی و اقتداء کیلئے ہوتی ہے۔
پس اسکے کسی فعل میں اگر افراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام امت کی راہ کج ہو جائیگی۔

اس افراط کا سبب یہ ہے کہ وہ انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتا ہے
باطن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اسلئے پیغمبر کبھی کسی شخص کی اصلاح سے
مایوس نہیں ہوتا کوئی شخص انکار و سرکشی کی کتنی ہی سخت و شدید حالت
اختیار کرے لیکن وہ ایک غمگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب کی
طرح لگا رہتا ہے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کر دیا
جائے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، ایمان نہ لائے گا وہ اسکے ایمان و ہدایت
سے مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ جب اللہ تعالےٰ اعلان کر دیتا ہے کہ فلاں
شخص اللہ کا دشمن ہے، اس پر ایمان و ہدایت کی راہ باز نہ ہوگی۔ اس سے
علیحدگی اختیار کر لو، تو اس سے برأت کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس معاملہ میں
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان
کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ	پس جب اس پر یہ بات کھل گئی
لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ	کہ وہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے
لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ	علیحدہ ہو گیا۔ بیشک ابراہیم بہت
....	ہی درد مند اور بردبار تھا۔

کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور اس کے تمرد کو دیکھکر اس کے ایمان و ہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی کہ اس سے مایوسی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے جینے اور پنپنے کی ایک ہلکی سی آس باقی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اس طرح کے واقعات پیش آنے کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر دلوں کے حال سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کو دیکھکر ایک فیصلہ کرتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے معاملات میں فیصلہ کا انحصار باطن کی حالت پر ہے۔ پس اس معاملہ میں صرف علام الغیوب ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ کسی جماعت سے اعراض کا حکم دیتا ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا کہ اب یہ جماعت ایمان نہیں لانے کی اور بعض اوقات پیغمبر کو کسی مخصوص جماعت کے ساتھ صبر و ثبات اور مجاہدہ و ریاضت کا حکم دیتا ہے کیونکہ ابھی اس کے اندر صلاحیت کی گرمی موجود ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پیغمبر کی باگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس کو آگے بڑھاتا ہے، کبھی روک لیتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں کسی خاص

اصول حکمت پر مبنی ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نعمت ایسے لوگوں پر پیش کرتا ہے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ ایسے مواقع پر اس کو اعراض کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کو مفرط جوش دعوت پر پُر محبت عتاب ہوتا ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی قوم کی سرکشی و نافرمانی سے اس کو غیرت حق لاحق ہوتی ہے اور وہ ان سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو جانا چاہتا ہے۔ ایسے مواقع پر اسکو پُر عتاب حکم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تبلیغ و دعوت کا جہاد جاری رکھے اور جبتک حکم خداوندی نہ ہو وہ حق کو کتنی ہی بیدردی کے ساتھ ٹھکرائیں لیکن وہ صبر و ضبط کو ہاتھ سے نہ دے۔ غرض کبھی اس کے کمال رحمت و شفقت پر عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق پر۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[عبس] منہ بنایا، تیوری چڑھائی، ترشرو ہوا۔ اس کی مزید تشریح تولّٰی نے کردی۔ تولّٰی یعنی اعراض کیا۔

[اَن جاءہ] اصل میں "لِاَن جاءہ" ہے۔ یہ ترشرو ہونے کا سبب بیان ہوا کہ دراصل ترشروئی کا باعث اس وقت نابینا کا آنا تھا، نہ کہ اسکی ذات۔

مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

[الاعمیٰ] نابینا۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہاں مراد ابن ام مکتوم رضہ ہیں۔ ان کا نام بھی لیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے سے ایک طرف تو ان کے ضعف و احتیاج کی حالت ظاہر ہو گئی دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلعم کی اس وقت کی مشغولیت سے بالکل لاعلم تھے۔ پس مقتضائے حال کی بے شمار بلاغتیں اس لفظ کے اندر پنہاں ہیں۔

[وما یدریک لعله یزکّیٰ] ما یدریک کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اس کا قائم مقام "لعله یزکّیٰ" ہے۔ یہ حسب قاعدۂ مقابلہ مفعول محذوف کا خود پتہ دے رہا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے "وما یدریک لعل الساعة قریب" یعنی تمھیں کیا خبر کہ قیامت بہت دور ہو شاید وہ قریب آگئی ہو۔ دیکھو لعل الساعة قریب کے ٹکڑے نے اصل مفعول کی طرف خود انگلی اٹھا دی۔ کیونکہ جملہ کی نوعیت مقتضی ہے کہ اس کا ایک مقابل یہاں محذوف مانا جائے۔ پس آیت کی تاویل یہ ہو گی کہ تمھیں کیا معلوم کہ اس کا آنا سد ہار اور دھیان کیلئے نہیں ہے کہ تم کفار کے طعنہ کی شرم میں پڑ گئے کہ وہ کہیں گے "محمدؐ کے پیرو اندھے اور عاجز لوگ ہیں۔ جو بیوقوفی اور طمع کی وجہ سے ان کی باتوں میں آگئے ہیں پس ہم انکی

پیروی کر کے ایسوں کی رفاقت کا ننگ کیسے گوارا کر سکتے ہیں"۔

اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلعم کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ابن ام مکتومؓ اس وقت تعلیم و تزکیہ کا کوئی مقصد لے کر آئے ہیں۔ آپ کو جو چیز ناگوار ہوئی وہ محض ان کا اس وقت کا آنا تھا اور اس کا باعث وہی خیال تھا جو اوپر بیان ہوا۔ باقی رہی یہ بات کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم قرآن کی درخواست کی اور آپ نے اعراض فرمایا تو یہ بات از روئے روایت بھی ثابت نہیں۔ اور از روئے قرآن اس کے ضعف کا جو حال ہے وہ نمایاں ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

[یزکّٰی] سدھرنا چاہتا ہو ـــــ یعنی آنحضرت صلعم کی صحبت اور آپ کی دعا کی برکت سے۔

[یذّکّر] دھیان کرنا چاہتا ہو ـــــ یعنی قرآن سے اور پیغمبر کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔

[استغنٰی] بے پروا ہوا ـــــ یعنی تزکیہ و تذکرہ اور انابت و خشیت سے ـــــ ان چیزوں کا ذکر اس لئے حذف کر دیا کہ ماقبل و مابعد کا تقابل اس پر دال تھا۔

[تصدّٰی] دراصل تتصدد تھا۔ یہ صداد سے ہے جس کے معنی

متوازی اور متقابل کے ہیں۔ عام بول چال میں کہتے ہیں۔ داری بجملا دداره پس تصدّی کے معنی ہوئے تعرض کرنے کے۔ یہ توّلی کا ضد ہوا۔

[وما علیك الا یزکّی] یعنی اگر وہ سدھرنا نہ چاہے تو اس کا بار الزام تم پر نہیں۔

[یسعٰی] وہ دوڑ کر آتا ہے ـــــ لیکن اس دوڑ کر آنے سے وہ دوڑنا مراد نہیں ہے جو پاؤں سے ہوتا ہے۔ یہ دل کے بیتابانہ شوق کے لئے ایک پُر کنایہ طریقہ تعبیر ہے۔ موقع کلام اس پر دال ہے۔ نیز وھو یخشٰی، سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

[یخشٰی] ڈرتا ہے ـــــ بظاہر ایک جامع اور مطلق لفظ ہے، لیکن خوف قیامت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سابق سورہ میں بالکل واضح کر دیا ہے انما انت منذر من یخشاھا۔ تم تو بس انہی کو ڈرانیوالے ہو جو قیامت سے خوف کھاتے ہیں۔

[تلھّٰی] دراصل تتلھّٰی ہے ـــــ تلھّٰی عنہ کے معنی ہیں اس سے غافل ہوگیا۔ الھانی عند ذلك کے معنی ہوئے۔ مجھے فلاں چیز نے اس سے پھیر لیا اور میں اس کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ عقبہ بن بجیر کا شعر ہے

لحافی لحاف الضیف والبت بیتہ ولم یلھنی عند غزال مقنع

میرے دروازہ پر اگر کوئی مہمان اتر پڑتا ہے تو میرا اوڑھنا بچھونا مہمان کا اوڑھنا بچھونا اور

ہر گھر مہمان کا گھر بنجاتا ہے اور کوئی برقعہ پوش ہرنی (نازنین) مجھے اس سے غافل نہیں کرتی۔

۴۔ ان آیات کا موقع نزول اور واقعہ کی اصلی تصویر

یہ آیتیں اس موقع پر نازل ہوئی ہیں جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آنحضرت صلعم منکرین کے پیچھے وقت نہ ضائع کریں اور اپنی تمام توجہ اور سرگرمی کا مرکز مسلمانوں کو بنائیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابتدا میں آنحضرت صلعم کو یہ حکم ہوا تھا کہ آپ سب سے پہلے اپنی قوم کے ان سرداروں کو دین حق کی دعوت دیں جو قوم میں دینی پیشوائی کے منصب پر متمکن ہیں اور ساتھ ہی آپ کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ اگر یہ لوگ اعراض کریں اور کفر و انکار پر جم جائیں تو آپ ان کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے ساتھ مشغول ہو جائیں اور اپنا سارا وقت انہی کی تعلیم و تربیت پر صرف فرمائیں۔

بعض ابتدائی آیات میں اس معاملہ کے تمام مراحل کی پوری تفصیل کر دی گئی تھی۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ	اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو خدا کے
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ	عذاب سے ڈراؤ اور جن مومنین نے تمہاری
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ	پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو، پس
عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا	اگر (تمہارے رشتہ دار) تمہاری بات نہ

تَعۡمَلُوۡنَ۔ وَتَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ	ماننیں تو تم کہہ دو کہ میں تمہارے فعل
الرَّحِیۡمِ۔ اَلَّذِیۡ یَرٰىکَ	سے بری ہوں اور خدائے عزیز و رحیم
حِیۡنَ تَقُوۡمُ۔ وَتَقَلُّبَکَ	پر بھروسہ کرو۔ جو تم کو دیکھتا ہے جب تم
فِی السّٰجِدِیۡنَ۔	اٹھتے ہو اور (دیکھتا ہے) نمازیوں میں
. . . .	تمہاری آمد و شد کو۔

اس ہدایت کے بموجب آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں مشغول ہوئے لیکن قوم کی طرف سے آپ کی دعوت کا جواب تکبر اور گھمنڈ کے انکار کے ساتھ دیا گیا۔ تاہم آپ بد دل نہ ہوئے، محبت کے جوش اور دعوت حق کی سرگرمی میں، اعراض و انکار کی ان تمام سختیوں کو جھیلتے رہے۔ آپ کو توقع تھی کہ یہ بیگانگی عارضی ہے۔ جلد وقت آئے گا کہ یہ لوگ آپ کی باتیں مان لیں گے۔ چنانچہ عناد و مخالفت کے ہیجان میں وہ لوگ جتنے ہی آپ سے دور ہٹتے جاتے آپ محبت و رافت کے جوش میں اسی قدر ان سے قریب ہوتے جاتے۔ اور اس کے چند خاص اسباب تھے۔

اولاً محبت و شفقت کا وہ بے پایاں جذبہ جو رحمۃ للعالمین کے ساتھ مخصوص تھا، اور جس نے آپ کی نگاہوں میں دشمنوں کو عزیزوں سے زیادہ

محبوب بنا دیا تھا۔

ثانیاً رسالت عظمیٰ کے فرائض کی ذمہ داریوں کا احساس۔

ثالثاً یہ خیال کہ طاقتوروں اور دولتمندوں کا ایمان دین حق کی تائید وتقویت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے سابقون الاولون کے ذریعہ سے آپ کے اس خیال کی تصدیق فرمادی۔

رابعاً یہ اندیشہ کہ مبادا ادائے فرض کی راہ میں جو صبر وجہاد مطلوب ہے اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہو جائے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھیں۔ رافت ورحمت کے بے پایاں جذبہ اور ادائے فرض کے حقیقی جوش کا تقاضا یہی تھا کہ آنحضرت صلعم ایسا ہی کریں لیکن اس معاملہ کے بعض پہلو ایسے تھے جو مقام نبوت کے شایان شان نہ تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ اولاً تو اس میں ان لوگوں کے حقوق سے تھوڑی سی بے پروائی کا اندیشہ تھا جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق تھے یعنی مومنین خالصین، ثانیاً اس سے نبوت کے اس وقار کو ٹھیس لگتی جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف سربلندی اور برتری ہی پسند

کی ہے۔ پستی اور جھکاؤ کبھی نہیں چاہا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں آپ کو متعدد مقامات میں عزت، مومنین، صالحین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہوجانے کا حکم دیا گیا۔ منکرین کے پیچھے وقت ضائع کرنے اور ان پر غم کھانے سے روکا گیا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى	پس شاید تم ان لوگوں کے پیچھے مارے غم
اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا	کے اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے اگر یہ لوگ
الْحَدِيْثِ اَسَفًا (کہف ۶)	اس بات کو نہ مانیں گے۔
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ	اور (اے پیغمبر) اپنے آپ کو ثابت قدم
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ	رکھو، ان لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام
وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ	اپنے رب کو پکارتے ہیں اسکی رضا طلبی
وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ	میں اور دنیاوی زندگی کی زینت کی
تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	کھوج میں تمہاری نگاہیں ان سے
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ	ہٹنے نہ پائیں اور تم ان لوگوں کی بات
عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ	پر کان نہ دھرو جن کے دل ہم نے
وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا	اپنی یاد سے غافل کر دیئے ہیں اور

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ....

(۲۸ - ۲۹ کہف)

جنھوں نے اپنی خواہش کی پیروی کی ہے اور جن کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے کہہ دو کہ حق تمھارے پروردگار کی جانب سے ہے پس جسکا جی چاہے ایمان لائے اور جسکا جی چاہے انکار کرے

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ

(الذاریات ۵۴)

پس تم ان سے اعراض کرو، تم کو کوئی ملامت نہیں ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ جب کبھی ایسا ہوا کہ جوش تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے انہماک و سرگرمی کی وہ حالت اختیار کر لی جو حد اعتدال سے کچھ متجاوز ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک کر جادۂ اعتدال پر کھڑا کر دیا۔ انہی حالات کے اندر اتفاق سے یہ ابن ام مکتومؓ والا واقعہ پیش آگیا۔ وحی الٰہی تعلیم و تربیت کیلئے مناسب حال واقعات کی منتظر ہی رہتی تھی۔ پس یہ واقعہ ایک ایسی سورہ کے نزول کا باعث بن گیا جو اغنیاء کی زجر و توبیخ، غریبوں کی مدح و ستائش اور دل شکستوں کی دلداری و ہمدردی پر ایک بلیغ ترین خطبہ اور جامع ترین موعظت ہے۔ اور آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی جو اصرار و الحاح کی شکل اختیار کر لیتے تھے اس پر بھی اس میں نہایت واضح لفظوں میں تنبیہ ہوگئی کہ آپ منکرین کے پیچھے

اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ صرف مومنین کی اصلاح و تربیت میں لگیں، جو آپ کی شفقتوں کے اصلی مستحق ہیں۔

واقعہ کی اصلی صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس سادات قریش بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ان کو تبلیغ و دعوت فرما رہے تھے۔ اسی بیچ میں ابن ام مکتوم رض آگئے۔ آنحضرت صلعم کو اندیشہ ہوا کہ اب یہ بدک جائیں گے اور کہیں گے، تم نے چند اندھوں اور غریبوں کو طمع دلا کر اور بیوقوف بنا کر پھنسا رکھا ہے اور اب ہمارے لئے دام بچھاتے ہو، تو ہم تو اس وقت تک تمہارے پیرو نہیں ہونے کے جب تک تم ان کو اپنی پیروی سے خارج نہ کردو، ہم اشراف ہو کر ان اراذل کی سطح پر نہیں اتر سکتے۔

آنحضرت صلعم کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ سادات قریش اس خیال کو بار بار ظاہر کر چکے تھے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ — جواب دیتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں

السُّفَهَآءُ (بقرہ ۱۳) — جسطرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں۔

دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ — اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو ہوشیار کرو

أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ
لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا
شَفِيعٌ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ وَلَا
تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ
يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ
مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ
وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ
مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ
وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ
مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ
بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ
بِالشَّاكِرِينَ۔ وَإِذَا جَاءَكَ

جو ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع
کیے جائیں گے اور اسوقت خدا کے
سوا نہ ان کا کوئی دوست ہوگا اور
نہ سفارشی۔ تاکہ وہ پرہیزگاری اختیار
کریں۔ اور نہ دھتکارو ان لوگوں کو
جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے
ہیں اوسکی رضا جوئی میں۔ تم پر ان کی
جواب دہی کچھ نہیں ہے اور نہ تمھاری
جواب دہی کچھ ان پر ہے کہ تم ان کو
دہتکار کر ظالموں میں بنجاؤ۔ اور اسی
طرح ہم نے بعض کو بعض سے آزمایا ہے
تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ
نے ہم میں سے فضل کیا ہے؟ کیا اللہ
شکرگذار بندوں کو نہیں جانتا۔ اور
جب تمہارے پاس آئیں وہ لوگ

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا
فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ
رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ
اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ
بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۴ - پ ۷ الانعام)
فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ
عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّا كَفَيْنٰكَ
الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ
يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ
وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ
يَضِيْقُ صَدْرُكَ
بِمَا يَقُوْلُوْنَ (۹۴-۹۷ الحجر)

جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر
تو کہو تم پر سلامتی ہو۔ تمھارے پروردگار
نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے۔
کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی کوئی
برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ
کرے اور اپنی حالت کی اصلاح کر لے
تو بیشک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
پس تم کو جس بات کا حکم ملا ہے، کھولکر
سنا دو اور مشرکوں سے منہ پھیر لو۔ اور
مذاق اڑانیوالوں کیلئے جو اللہ کا ساجھی
ٹھہراتے ہیں ہم تمھاری طرف سے
بس ہیں۔ پس عنقریب ان کو معلوم
ہو جائے گا اور ہم کو معلوم ہے
کہ تم ان کی باتوں سے دل تنگ
ہوتے ہو۔

آنحضرت صلعم اپنی رافت و رحمت کی وجہ سے تمام غربا، و مساکین کے ملجا و ماوی تھے اور بوجہ شدت غیرت یہ کبھی نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ آپ کے ان صحابہ کی توہین ہو جن کو کسی طمع دنیاوی نے نہیں، محض طلب رضائے حق نے آپ کے اردگرد اکٹھا کر دیا ہے۔ پس اس موقع پر عبداللہ بن ام مکتوم رض کے آجانے سے آپ کو اصلی اندیشہ یہی ہوا کہ یہ اشقیا، ان کی پھٹی حالت دیکھکر اس کو صحابہ رض پر زبان طعن دراز کرنے کا ایک بہانہ بنالیں گے اور ان کی توہین کریں گے۔ پس آپ نے جو کچھ کیا غیرت حق اور مصالح تبلیغ و دعوت کے تقاضے سے کیا لیکن اسی سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ آنحضرت جوش تبلیغ و دعوت میں اپنے حدود سے کسی قدر آگے نکل گئے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آپ کو متنبہ کر دیا کہ آپ نے اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اور کلام کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے بظاہر عتاب مترشح ہوتا ہے، لیکن عتاب کا اصلی رخ کفار و منکرین کی طرف ہے۔ آنحضرت صلعم کی طرف نہیں ہے۔ آپ کی تو اس میں تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی آپ کے صحابہ کی بھی دلداری کی گئی ہے۔

معاملہ کی اصلی توضیح کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت

مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جائے چرواہا اسکی تلاش میں نکلے۔ ہر قدم پر اسکی کھر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں جنگل کے کسی گوشہ سے اسکی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصلی گلے سے تھوڑی دیر کیلئے غافل ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب واپس لوٹتا ہے۔ آقا اس کو ملامت کرتا ہے۔ کہ "تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے اس کو چھوڑ دیتے بھیڑیا کھا جاتا، وہ اسی کی مستحق تھی، بتاؤ اس میں عتاب کس پر ہوا، چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ ظاہر ہے کہ کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ چرواہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلداری ہوئی۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا روئے سخن بظاہر آنحضرت صلعم کی طرف ہے۔ لیکن خفگی کا تمام زور منکرین و معاندین پر پڑتا ہے۔ آنحضرت صلعم کیلئے تو اس عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جاں نوازادئیں پنہاں ہیں۔

تعجب ہے کہ سورہ کا یہ مفہوم نہایت واضح ہونیکے باوجود بعض مفسرین سے مخفی رہ گیا اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔ ہم آگے کی فصلوں میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وبیداللہ التوفیق۔

۵۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ

مجاہد سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سرداران قریش میں سے کسی سے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ وہ قبول کرے گا کہ اسی بیچ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضؓ آ گئے۔ آنحضرت کی نظر پڑی تو آپ کو ان کا ایسے وقت میں آنا ناگوار ہوا کہ یہ قریشی کہے گا کہ محمدؐ کے پیرو اسی قسم کے اندھے بہرے اور غریب و بے نوا لوگ ہیں اس پر یہ آیت اتری۔

یہ تاویل حضرت مجاہد کی تاویل ہے۔ اور جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں، قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بالکل ظاہر ہے لیکن بعض لوگوں کو اس واقعہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں ہو گئی ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتوم رضؓ نے آنحضرت صلعم سے تعلیم و ارشاد کی درخواست کی اور آپ نے ان سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا اور اس قول کو وہ بعض اکابر سلف سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت کسی قریشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتوم رضؓ نے پہنچکر

درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ ان کی یہ بے موقع درخواست آپ کو ناگوار ہوئی اور یہ آیت اتری۔ بعض لوگ انہی حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مجلس میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے جیسے صناوید قریش شریک تھے۔ بعض لوگ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم، عتبہ بن ربیعہ عباس بن عبد المطلب، ابوجہل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ نے آکر درخواست پیش کی کہ علمنی مما علمك الله (اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیے) آپ کو ان کی یہ بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ بعض لوگ حضرت ضحاک سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت اشراف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ پہنچے اور انھوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ ایسے وقت میں آنحضرت صلعم کے پاس پہنچے کہ آپ عتبہ وشیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور روایت ابو مالک سے ہے کہ آپ کی گفتگو امیہ بن خلف سے تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔

ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب ایسے

لوگوں پر منتہی ہوتی ہیں جن میں سے کوئی شریک واقعہ نہیں تھا۔ پس اگر انکی صحت تسلیم بھی کرلی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہوگی، خبر کی نہ ہوگی۔ پھر ان میں باہمد گر اس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک تاویل اختراع کی اور جھٹ اس کے لئے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کردی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باعتبار سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں ان میں سے ایک بھی قابل اعتماد نہیں۔ اور قرآن مجید سے بوجوہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

۱۔ آیت کے الفاظ میں کہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم نے نابینا کو دیکھکر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترشرو ہوئے (جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے) اور اگر آپ ایسا کرتے بھی تو ایک نابینا کو اس ترش روئی کا کیا احساس ہوتا! آپ کی آزردگی کا باعث محض ان کا آنا تھا کیونکہ اس سے ان سرکشوں کو موقع مل رہا تھا کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ پر طعن کریں اور آپ کی مخالفت کا ایک بہانہ پیدا کرلیں۔ مکی زندگی میں آنحضرت صلعم کی تمام دعوت کا تعلق، توحید معاد، اور رد شرک سے تھا اور یہ اس درجہ قطعی اور واضح مسائل تھے کہ مخالفین

ان کے جواب میں معارضہ کا کوئی پہلو مشکل ہی سے پاتے اس لئے ہمیشہ اس گھات میں رہتے
کہ اگر مجادلہ کا کوئی موقع نہیں ملتا تو استہزا و استخفاف ہی کا کوئی نکتہ ڈھونڈھ نکالیں اور
یقیناً عبداللہ بن ام مکتوم کے اس موقع پر آجانے سے ان کی یہ غرض پوری ہو رہی تھی۔

۲۔ (وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰیٓ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی) اس امر پر
نہایت واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات بالکل نہیں معلوم تھی کہ نابینا کا آنا
طلب علم اور حصول ہدایت کے لئے تھا۔ اگر یہ بات آپ کو معلوم ہوتی، آپ نہایت خندہ
پیشانی سے اس کا استقبال کرتے۔ کیونکہ طلب علم و ہدایت سے بڑھکر پیغمبر کو کوئی
چیز محبوب نہیں ہو سکتی۔ وما یدریک لعلہ یزکی کے اسلوب سے یہی بات نکلتی
ہے کیونکہ اس اسلوب کو اگر خوب پھیلا دو تو پوری بات یوں ہو گی، تم آزردہ
ہوئے کہ اس کا آنا ایک ایسی حالت میں ہوا جو تمھیں ناپسند ہے حالانکہ تمھیں کیا
خبر، ممکن ہے وہ اپنے ساتھ کوئی ایسا مقصد لیکر آیا ہو جس میں تمھارے دل کی اصلی
خوشی پوشیدہ ہو۔

غرض قرآن مجید سے یہ کسی طرح ثابت نہیں کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات معلوم
تھی کہ نابینا کا آنا تعلیم و تذکر کے کسی دینی مقصد کے لئے ہے اور اس کے باوجود
آپ نے ناخوشی کا اظہار کیا ہو۔

۲۔ (وما علیک الا یزکی) سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ تبلیغ ودعوت کے معاملہ میں آنحضرت صلعم نے انہماک کی غیر معتدل حالت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ اس پر آپ کو ہدایت ہوئی کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی کہ خواہ مخواہ کون کے ایمان کیلئے تم ان کے پیچھے چمٹے رہو۔ اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً لست علیھم بمصیطر۔ تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔ فتول عنھم فما انت بملوم ان سے اعراض کرو تم کو کوئی ملامت نہیں۔ فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین اگر وہ اعراض کر جائیں تو کچھ غم نہیں تم پر تو صرف کھولکر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔

ان آیات کا حاصل مطلب سامنے رکھکر زیر بحث آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں باندازِ عتاب آنحضرت صلعم کے اس بوجھ کو ہلکا کیا گیا ہے جو تبلیغ ودعوت کے عشق میں آپ نے اپنے سر پر اٹھالیا تھا۔ یقیناً عتاب کا یہ انداز اس عتاب سے بالکل مختلف ہے، جو آنحضرت صلعم پر ہونا چاہئے تھا اگر آپ نے واقعتہً کسی کمزور مسلمان سے بربنائے تحقیر اعراض کیا ہوتا۔ پھر اما من استغنی فانت لہ تصدی کے ٹکڑے سے واضح ہے کہ سرداروں اور اغنیاء کے ساتھ

آنحضرت صلعم کا یہ اعتنا محض عشق دعوت اور جوش تبلیغ کا نتیجہ تھا یہ بات نہ تھی کہ آپ غربا کو حقیر سمجھتے رہے ہوں۔

۴۔ ان آیات کے بعد والے ٹکڑے یعنی کلا انها تذکرة فمن شاء ذکرہ میں اس امر کی کھلی ہوئی تعلیم ہے کہ آنحضرت صلعم ان لوگوں سے بالکل بے پروا ہو جائیں جو اللہ کی یاد سے بے پروا ہو گئے ہیں اور ان کی تالیف و دلجوئی کیلئے ہرگز اس قدر نیچے نہ اتریں جس قدر نیچے اترنا آپ نے گوارہ فرمالیا ہے۔ پھر فرمایا اما من جاءک یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت عنہ تلھیٰ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کی اس درجہ مشغولیت آپ کی اور کتاب الٰہی کی عظمت کے شایان شان نہیں ہے۔

۵۔ پھر وہ تمام روایتیں تسلیم بھی کر لی جائیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ ابن ام مکتومؓ قرآن مجید سیکھنے آئے تھے، یا کوئی مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے، یا طلب ہدایت کے لئے آئے تھے جب بھی یہاں کسی واقعی عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ آئندہ ہم اس کی مزید توضیح کریں گے۔

خلاصہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ ان آیات اور ان کے پیش و عقب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت صلعم کو استغنا، اور شایان شان ترفع کی تعلیم دی گئی ہے اور نہایت بلیغ ترین اسلوب عتاب میں آپ کو تبلیغ و دعوت

میں مفرط انہماک سے روکا گیا ہے۔ پھر اس میں آنحضرت صلعم کی دلداری، غربا کی دلجوئی اور اغنیاء کی توبیخ کے نہایت لطیف پہلو ہیں جو آیندہ مباحث میں سامنے آئینگے۔

(۶) پہلی غلطی سے بڑی غلطی

صحیح تاویل کے واضح ہو جانے کے بعد ان باتوں کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، جو یکسر توہمات پر مبنی ہیں لیکن ہم ایک خاص امر کا ذکر یہاں ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ کمزور روایات پر اعتماد کرنے سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان سے کس درجہ احتیاط ضروری ہے۔

حضرت امام رازیؒ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ وہ اس بات کو فوراً سمجھ گئے کہ یہاں خفگی اور عتاب کا کوئی موقع نہیں تھا لیکن چونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت پر عتاب ہوا اسلئے ان کو فکر ہوئی کہ کسی نہ کسی شکل سے عتاب کا کوئی موقع پیدا کریں، چنانچہ انھوں نے پورے مقدمہ کو از سر نو مرتب کیا اور پھر جن نتائج تک پہنچے انکی تفصیل سننے کے قابل ہے۔

وہ پہلے سوال قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آنحضرت صلعم پر عتاب کیوں فرمایا حالانکہ بوجوہ ذیل مستحق زجر و تنبیہ ابن ام مکتومؓ تھے؟

۱۔ مانا کہ ابن ام مکتومؓ نابینا تھے لیکن وہ سرداران قریش کے ساتھ آنحضرت صلعم گفتگو سنکر معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان کا بیچ میں مداخلت کرنا یقیناً آنحضرت صلعم کی ایذا کا باعث ہوا ہوگا اور یہ معصیت ہے۔

۲۔ یہ مسلم ہے کہ اس وقت جو اہمیت سرداران قریش کے معاملہ کو تھی وہ اہمیت ابن ام مکتومؓ کے معاملہ کو نہ تھی۔ ابن ام مکتومؓ بلحاظ ضرورت رسالت سے فیضیاب ہو چکے تھے اور یہ کفار ہنوز بالکل محروم تھے اس لئے ان سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے۔ پھر ان کے اسلام سے بہتوں کے قبول اسلام کی راہ باز ہوتی۔ پس ایسی حالت میں ابن ام مکتومؓ نے مداخلت کرکے اسلام کی ترقی کے ایک نہایت مفید موقع کا خون کیا۔

۳۔ قرآن مجید میں وارد ہے ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اکثر نا سمجھ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کو صحابہؓ کی تادیب و اصلاح کا اختیار حاصل تھا اور آپ برابر مختلف امور پر صحابہؓ کو زجر و تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ پھر ایک ایسے امر پر آپ کیوں معتوب ہوئے جس کا آپ کو اختیار حاصل تھا۔

حضرت امام رازیؒ ابن ام مکتومؓ کے مستحق زجر و تنبیہ ہونے کے اتنے وجوہ بیان کرنیکے بعد فرماتے ہیں۔

کہ اس موقع پر اتنے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جواب کی تقریر
یوں شروع کرتے ہیں۔

ان اشکالات کے دو جواب ہیں۔

اول یہ کہ اگرچہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی لیکن
اس کی ظاہری شکل سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آنحضرت صلعم دولتمندوں کو غریبوں
پر مقدم کرنا چاہتے ہیں اس لئے آپ پر عتاب ہوا۔

ہمارے نزدیک یہ وجہ ہر چند قبح سے خالی ہے لیکن ضعف سے محفوظ
نہیں۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ترغیب کو جانتا ہے، اور
اس کا عتاب ہمیشہ کسی بات سے روکنے کے لئے ہوتا ہے تو کیا یہاں پیغمبر صلعم
کو صحابہ کی تنبیہ سے روکا گیا ہے۔ حالانکہ اس بات کی آپ کو اجازت حاصل تھی۔

امام رازی کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے فعل کے اس ظاہری
نتیجہ پر عتاب نہ ہوا ہو بلکہ واقعۃً یہ بات ہوئی ہو کہ قرابت، شرافت، اور
علوئے منصب کی وجہ سے آنحضرت صلعم کا دل ان سرداروں کی طرف مائل
ہو گیا ہو اور ابن ام مکتومؓ چونکہ اندھے تھے اور رشتہ و قرابت کی کوئی وابستگی بھی
آپ سے نہیں رکھتے تھے نیز شرف خاندانی کے اعتبار سے بھی فروتر تھے اس لئے

ممکن ہے آپکے دل میں ان سے کچھ نفرت پیدا ہوگئی ہو۔ اور اس پر عتاب ہوا ہو۔

اس دوسرے جواب کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ حضرت امام رازی پر رحم فرمائے، ام مکتوم ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی کی خالہ تھیں۔ اس تعلق کے بعد شرف و قرابت کی وہ کونسی بلندی باقی رہ گئی ہے جو ان کے بیٹے کو حاصل نہیں ہوگئی۔ پھر یہ کیسی دردانگیز بات ہوگی کہ ایک پیغمبر ایک شخص سے اس لئے نفرت کرے کہ وہ اندھا ہے۔ اندھے سے زیادہ ہمدردی و غمگساری کا حقدار کون ہے۔ اور اگر پیغمبر بھی اس سے نفرت کرے گا تو اسکی دلداری اور محبت کے لئے کون آئے گا! یہ بات تو ایک مومن کی شان سے بھی فروتر ہے۔ نبی اور رسول کا کیا ذکر!

غور کرو، معاملہ کی نوعیت کس قدر عجیب و غریب ہے۔ امام رازیؒ پہلے وہلہ میں ٹھیک بات پا لیتے ہیں کہ یہاں آنحضرت صلعم پر عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن پھر ان کو تفسیر کی وہ تمام روایتیں یاد پڑ جاتی ہیں جنمیں آنحضرت کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بات بول اٹھتے ہیں جس کو سنکر آدمی کا کلیجہ کانپ اٹھے۔ انھوں نے اس بات کا تو خیال رکھا کہ اللہ تعالیٰ کو بے محل عتاب کے الزام سے بچا لیں لیکن اس بات کو بالکل

بھول گئے کہ ان کے جواب سے آنحضرت صلعم کے خلق عظیم کا دامن ایک سنگین الزام
سے آلودہ ہو رہا ہے۔

لیکن یہ ساری مشکلات تفسیری روایات کی پیدا کردہ ہیں۔ جن لوگوں
کی نظر، قرآن مجید کے سیاق وسباق اور آنحضرت صلعم کے حالات زندگی
پر ہے ان کے نزدیک اس تاویل اور ان تمام ضعیف روایات کی کوئی
اصلیت نہیں ہے۔

ان آیات کا ربط آگے سے

ان آیات کے اندر آنحضرت صلعم کو آپ کے بلند منصب کی طرف توجہ
دلائی گئی تھی کہ آپ مغروروں اور سرکشوں کے ساتھ الحاح واصرار کی ایسی شکل
اختیار نہ کریں جو آپ کے رتبہ سے فروتر ہو۔ صرف مومنین کے ساتھ مشغول ہوں
جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق ہیں۔ یہ مضمون مقتضی ہوا کہ یہاں مختصراً اس چیز کی رفعت
شان بھی بیان کردی جائے۔ جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ تاکہ یہ اچھی طرح واضح
ہو جائے کہ جو لوگ ایسی گرانمایہ نعمت سے منہ پھیر رہے ہیں وہ اعراض ہی کے
مستحق ہیں۔ فرمایا:۔

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُ (۱۲) فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۱۴) بِأَيْدِي سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍ بَرَرَةٍ (۱۶)
قُتِلَ الْإِنسَانُ مَآ أَكْفَرَهُ (۱۷) مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (۱۸) مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ (۱۹) ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ (۲۰) ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ (۲۱) ثُمَّ إِذَا شَآءَ أَنشَرَهُ (۲۲)

کچھ نہیں! یہ ایک یاد دلانا ہے (۱۱) سو جس کا جی چاہے اس کو یاد کرے (۱۲) قابل ادب، بلند اور پاک اوراق میں (۱۳) (۱۴) ذی رتبہ نیک منشیوں کے ہاتھ میں (۱۵-۱۶) برا ہو آدمی کا یہ کتنا ناشکرا ہے (۱۷) اسے کس چیز سے بنایا (۱۸) ذرا سے پانی سے اسے بنایا تو اس میں اندازہ رکھا (۱۹) پھر اس کی راہ اسے آسان کر دی (۲۰) پھر اسے مردہ کیا پھر اسے قبر میں رکھوایا (۲۱) پھر جب چاہے گا اسے اٹھائے گا (۲۲)

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[کَلَّآ] تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے جو غیر معتدل حالت اختیا کرلی تھی، اور جس پر آپ کو اوپر کی آیت میں تنبیہ فرمائی گئی کَلَّآ اس کو مزید

موکد کر رہا ہے۔ یعنی بے نیازی کی تعلیم کو یہ لفظ اور زیادہ زور و قوت کے ساتھ نمایاں کر رہا ہے۔ اس کا پورا مضمون گویا یہ ہوگا کہ تمھیں ہرگز زیبا نہیں ہے کہ تم ان سے اس درجہ چمٹو۔ بعد کے ٹکڑے سے اسکی پوری توضیح ہو جاتی ہے۔

[انہا تذکرۃ] اوپر لفظ ذکری گذر چکا ہے۔ ضمیر اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے مراد قرآن اور اس کی آیات ہیں۔ پہلے ذکری کا لفظ تھا، بعد میں تذکرۃ کا لفظ آیا ان دونوں کی رعایت مقتضی ہوئی کہ ضمیر مؤنث کی لائی جائے، یہ جملہ دلیل کے موقع میں ہے۔ لفظ کلا میں تعلیم استغنا کا جو مفہوم مضمر تھا، اس ٹکڑے نے اسکو کھولدیا۔

[فمن شاء ذکرہ] یعنی جو یاددہانی تم ان کو سنا رہے ہو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔ یہاں چونکہ متبادر مفہوم کا خیال رکھا اس لئے ضمیر مذکر کی لائے۔ کیونکہ بادل وہلہ ذہن قرآن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ جملہ "انہا تذکرۃ" کی تشریح کر رہا ہے۔ یعنی قرآن محض ایک یاددہانی اور پیام ہے جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے جس کا جی چاہے انکار کر دے۔ اکراہ یا اصرار و الحاح کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اس جملہ میں نہایت ایجاز ہے۔ بات

کا صرف ایک حصہ مذکور ہوا ہے، مقابل کا دوسرا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔
کیونکہ مذکورہ حصہ خود محذوف کو واضح کر رہا ہے۔ اگر اس محذوف کو کھولدیا
جائے تو پوری بات یوں ہوئی، سو جس کا جی چاہے یاد کرے اور جس کا جی
چاہے نہ یاد کرے، بعض مواقع پر اس مضمون کی تشریح ہوگئی ہے۔ فمن
شآء فلیومن ومن شآء فلیکفر، پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور
جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

[صُحُفٍ] جمع ہے صحیفۃ کی۔ صحیفہ کے معنی ہیں لکھا ہوا ورق۔ صحیفۃ
المتلمس، صحیفۃ الجور وغیرہ نام اسی معنی کے اعتبار سے پڑے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ
لفظ صفیحہ سے مقلوب ہے۔ صفیحہ چوڑی چکلی چیز کو کہتے ہیں۔ صفیحۃ الحجر، صفیحۃ السلف
صفیحۃ العنق نہایت مشہور استعمالات ہیں۔ لفظ اپنی جمع کی صورت میں
بعض اوقات، کتاب کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً رسول من اللہ یتلوا
صحفا مطھرۃ۔ فی صحف، در اصل ھو فی صحف ہے۔ اوپر جس
شے کا ذکر ہوا تھا اب اس کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ اوصاف
مابعد کے بیان میں مسند الیہ کا حذف ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں
اس کے شواہد بہت ہیں۔ کسی مقام پر ہم اس مسئلہ کو واضح کر چکے ہیں۔ اعادہ

کی ضرورت نہیں ہے۔

اوپر ہم نے جو تاویل بیان کی ہے۔ قرآن کی ان صفتوں پر غور کرو۔ انکے اندر بھی بعینہٖ وہی حقیقت بول رہی ہے۔ یعنی یہ قرآن جو اپنے رتبہ اور درجے کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے، اس کو اس اصرار و الحاح کے ساتھ پیش کرنا ہرگز اس کے شایان شان نہیں ہے۔ پس آنحضرت صلعم کو جو استغنار کی تعلیم دی گئی تھی، قرآن کی ان صفات نے اس کی دلیل بیان کر دی۔

[مَّرْفُوْعَةٍ] اس لفظ میں بلندی اور درجہ دونوں کا مضمون پنہاں ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تشریح ہوگئی ہے۔ مثلاً وانه فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم دوسری جگہ فرمایا والقران المجید اور یہ دونوں مضمون درحقیقت "مکرمة" ہی کی تشریح ہیں۔

[مُّطَهَّرَةٍ] یہ صفت بھی درحقیقت صفت تکریم ہی کے ایک پہلو کو واضح کر رہی ہے۔ یعنی قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کے دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا ہے۔ فی کتاب مکنون لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ایک اور مقام میں ہے بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ اور جہاں جہاں قرآن مجید کو "کتاب عزیز"

کہا ہے اس میں بھی عموماً اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

[سَفَرَۃ] سافر کی جمع ہے بمعنی قاری و کاتب۔ سفر کے معنی قرأت و کتابت کے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان میں باقی ہے۔ اسکے اصل معنی زخم لگانے کے ہیں۔ اسی سے کتابت کا مفہوم پیدا ہو گیا کیونکہ ابتدا میں جب کوئی چیز لکھنا چاہتے تو آہنی قلم سے اس کو کسی چیز پر کھودتے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ قرأت و بیان کے معنوں کے لئے وسیع ہو گیا۔ عبرانی میں ספר (سفر) قرأت و کتابت اور زخم لگانے کے معنی میں موجود ہے اور סֹפֵר (سافر) کاتب، فقیہ، امام اور قائد کے معنوں میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت قتادہ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ سفرہ سے مراد قرّاء ہیں۔ نیز حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ سفرہ نبطی میں قرار کو کہتے ہیں۔ زخم لگانے کے معنی میں ہماری عربی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ رؤبہ کا مصرعہ ہے:-

تسفین موسیٰ الصلع الجلام

اسی طرح کتب کا مادہ عربی زبان میں اپنے اصل معنی میں باقی رہ گیا ہے۔

[کرام] یعنی اس امانت کے لئے پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔ ان کی شرافت کی وجہ سے ان پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

[بَرَرَۃ] بار کی جمع ہے۔ بار اس شخص کو کہتے ہیں جو فرمانبردار اور اپنی ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنے والا ہو۔ اس صفت نے ان کی امانت داری کے وصف کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ اس مضمون کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات اشارہ کر رہی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:۔ نزلَ بہِ الرّوحُ الامینُ، دوسرے مقام پر ہے:۔ انّہٗ لقولُ رسولٍ کریمٍ، ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مُطَاعٍ ثم امینٍ

ان آیتوں کا مفاد قرآن مجید کی عظمت وشان کو بیان کرنا ہے کہ اس قدر بلند رتبہ اور اشرف چیز اس لئے نہیں ہے کہ اس اصرار و الحاح کے ساتھ ان لوگوں پر پیش کی جائے اور یہ لوگ اس سے اعراض کریں۔

علاوہ ازیں ان آیات سے قرآن مجید کی بعض نہایت اہم صفتیں روشنی میں آگئی ہیں۔ وہ اللہ تعالے کے پاس لکھا ہوا ہے، پڑھا جاتا ہے، ہر طرح کے اختلاط و امتزاج سے بالکل پاک ہے۔

ہاں ایک خاص بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہاں رفع، تطہیر، اور صحیفہ وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ تمامتر ایسے حقایق کی تعبیر کے لئے اختیار کئے گئے ہیں جن کا تعلق ملأ اعلیٰ سے ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف

مفاد اور نتیجہ ہے، باقی رہی انکی اصلی تاویل وتصویر تو یہ چیز اس مقام کے احوال و معاملات کے شایان شان ہوگی۔

[قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ] الانسان کے لفظ سے عموماً انسانوں کا غالب حصہ مراد ہوتا ہے یعنی کفار پس یا تو لام عہد کا ہوتا ہے یا یہ ہوتا ہے کہ بلحاظ کثرت پوری نوع پر ایک حکم لگا دیتے ہیں۔ فرمایا ان الانسان لظلوم کفار۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں (قتل) اصل حقیقت سے ہٹکر محض اظہار غضب کے لئے استعمال ہوا ہے (ما اکفرہ) میں اس غضب کا سبب بیان ہوا ہے اور انسان کی اس روش پر اظہار نفرت ہے۔

[مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ] یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے۔ اس کے بعد انسان کی حالت بیان ہوئی ہے، یہ ٹکڑا اس کی تمہید ہے۔

[نطفة] تھوڑا سا بچرا ہوا پانی۔ ابو صعترہ بولانی کا شعر ہے۔

فما نطفة من حب مزن تقاذفت   به جنبتا الجودی واللیل دامس

قرآن مجید میں ہے۔ ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهین ۔
اس لفظ کی حقیقت پر غور کرو اور دیکھو بعث کے بارہ میں جو استبعاد لوگوں کو نظر آتا تھا اس کو اس نے کس طرح دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے صاف واضح

ہے کہ انسان کی ابتدائی خلقت ہی اس طور پر ہے کہ اس کا مادہ مختلف گوشوں
سے نچوڑ نچوڑ کر جمع کیا گیا ہے۔ پھر جب ایک بات زندگی کے ایک مرحلہ میں ممکن ہوئی تو
وہی بات دوسرے مرحلہ میں کیوں ناممکن ہوجائے گی۔ اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے
قرآن مجید نے ایک جگہ نہایت لطیف اشارہ کیا ہے ولقد علمتم النشأة الاولیٰ
فلولا تذکرون اور تم اپنی پیدائش کا حال جان چکے ہو تو اس سے کیوں نہیں
سبق حاصل کرتے۔

[قَدَّرَہٗ] یعنی اس کے اعضاء اور قویٰ کیلئے اپنی مرضی کے مطابق ایک اندازہ
ٹھہرایا۔ اس سے مقصود انسان کے عجز و درماندگی اور خدا کے کمال تصرف و اقتدار
کا اظہار ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ فی ای صورۃ ما شآء رکبک اس میں اپنے
کمال تصرف و احاطہ کے علاوہ اپنے مخصوص فضل و احسان کی طرف بھی اشارہ
فرمایا کہ اس نے اپنے حسن تقدیر سے انسان کو اپنی بہترین مخلوق بنادیا۔ ایک آیت
نے اس مضمون کو بالکل واضح کردیا ہے۔ صورکم فاحسن صورکم یہاں اتنا ہی
پر اکتفا کرتے ہیں۔ تفسیر سورۂ تین میں اس کی تفصیلات ملیں گی۔

[السَّبِیل] اس میں الف لام عہد کے لئے ہے۔ یعنی وہ راستہ جس میں
انسان اپنے اعضاء و قویٰ کی مدد و رہنمائی سے گامزن ہوتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ

ہی کی طرف سے ہے کہ اس نے اعضاء و قویٰ عنایت کئے اور پھر ان کے استعمال کرنے اور برتنے کا ڈھنگ بتایا۔ اور اس کیلئے تمام اسباب و وسائل فراہم کر دیئے۔ چنانچہ فرمایا ہے الذی خلق فسوی والذی قدر فھدیٰ جس نے خلق کیا پھر تسویہ کیا اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر اس کی طرف رہنمائی کی۔ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا ہے ربنا الذی اعطے کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکی خلقت بخشی پھر رہنمائی کی۔ اور یہ بات قرآن مجید نیز اصول فطرت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے خیر و شر دونوں کی راہیں کھول دی ہیں اور دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے عقل و بصیرت بخش دی ہے، پس انسان جس کو چاہے، اختیار کرے۔ وہ ان میں سے کسی راہ پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا اِنَّا	پس ہم نے اس کو سمیع و بصیر بنایا بیشک
هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا	ہم نے اسکو ہدایت دی راستہ کی (موقع مقتضی
شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا	ہے کہ یہاں راستہ سے مراد خیر کا راستہ لیا جائے) چاہے
. . . .	وہ شکر گذار بنے یا ناشکرا۔

دوسری جگہ فرمایا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا — اور دل اور جیسا اس کو بنایا، پس اسکو
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا — سمجھ دی بدی اور نیکی کی کامیاب ہوا جس نے
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ — اسے صاف کیا اور ناکام ہوا جس نے اسکو
خَابَ مَنْ دَسّٰهَا — آلودہ کیا۔

قرآن مجید، اور عقل و نقل کی تمام شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ تیسیر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند سے اپنے لئے جو راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے اس راہ کو آسان کرتا ہے چنانچہ فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَ — سو جس نے سخاوت کی اور ڈر ڈھلا اور
صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ — اچھی بات کو سچ مانا، اس پر ہم سہج کر دینگے
لِلْيُسْرٰى، وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ — آرام دینے والی اور جس نے بخالت کی اور
وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى — بے پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس کو
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى — سہج کر دینگے مشکل میں ڈالنے والی۔

پس اس مقام پر تاویل یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو برائی اور بھلائی کی تمیز دی اور اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان دونوں راہوں میں سے

جس راہ کو چاہے اپنے لئے پسند کرے۔ ان میں سے کسی راہ پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اور اس کے تمام اعضاو قویٰ اور اسباب کو اس کے ارادہ کے ماتحت کیا، ان میں سے کسی چیز کو اس کے ارادہ پر حاکم نہیں بنایا۔ اور یہ وہ سب سے بڑی نعمت و سرفرازی ہے جو انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے حاصل ہوئی۔ اس کی پوری تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

[فَاَقْبَرَهٗ] قبرہ کے معنی ہیں اسکو دفن کر دیا۔ اور اقبرہ کے معنی ہیں اس کیلئے قبر بنائی۔

[اَنْشَرَهٗ] کھول دیا۔ پھیلا دیا، چھینٹ دیا۔ باب افعال مبالغہ کے مفہوم کے لئے بھی آتا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہو گا کہ دفن ہو جانے اور سڑ گل جانے کے بعد اس کو سیدھا اٹھا کھڑا کرے گا۔

۹۔ ان آیات کا باہمی نظم اور پیش و عقب سے تعلق

پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن مجید نہایت بلند و برتر کتاب اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کے بعد اس نعمت عظمیٰ سے انسان کی بے پروائی کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے اپنی قدرت کاملہ کے پہلو بہ پہلو انسان کے عجز و درماندگی کا حال بیان کیا تاکہ کمال فضل و احسان

کے آئینہ میں انسان اچھی طرح دیکھ لے کہ باہمہ ضعف و عجز اس کی بدبختیوں اور ناسپاسیوں کا کیا عالم ہے۔

اور چونکہ اسلوب بیان مقتضی تھا کہ انسان ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرے اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا شکر گذار ہو اس لئے اس کے بعد فرمایا:۔ (ما اکفرہ) انسان کتنا ناشکرا ہے! یعنی ان تمام افضال و عنایات کے باوجود اسکی ناسپاسیوں کو کفر و عصیان کا معاملہ کتنا عجیب ہے:

[من نطفۃ] سے لیکر [فاقبرہ] تک غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ان چند لفظوں کے اندر انسانی زندگی کے تینوں مرحلے، اول، وسط، آخر، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردیئے ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اس تھوڑے سے پانی سے پیدا ہوا، جو خدائے حکیم و قدیر کی حکمت و قدرت سے تمام جسم کے اطراف سے چھن چھن کر جمع ہوا۔ اسکے بعد اس پر اللہ تعالیٰ کے تمام تصرفات جاری ہوئے۔ یہ تمام تفصیل جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں، لفظ "نطفۃ" سے سمجھی جاتی ہے۔

مرحلہ وسطیٰ یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و فعل کے تمام گوشوں میں جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر سے کرتا ہے، بغیر اس کے اس کو کسی چیز

پر بھی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

آخری مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مارتا ہے اور قبر میں رکھواتا ہے۔ اس سے انسان کی کمال بے بسی اور عجز و درماندگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یکسر اپنے پروردگار کے قبضہ و تصرف میں ہے۔

ان حالات کے بعد، جو خدا کی قدرت اور پروردگاری پر مختلف جہت سے دلیل ہیں۔ یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے کے لئے ایک دن اٹھائے گا کیونکہ جو انسان مخلوق و مصنوع ہے اور زندگی و معشیت کے تمام گوشوں میں خدا کی بخشی ہوئی توفیق کی رہنمائی رکھتا ہے، عبث نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے پرسش اور جزائے اعمال کا بھی ایک دن ظہور میں آئے۔

اب پورے سلسلہ پر غور کرو کہ انسان اپنے آغاز کے روز اول سے لیکر اپنے اٹھائے جانے کے دن تک کس طرح عاجز و درماندہ ہے۔ اور تمام حالات کس طرح اسکی بے بسی پر دلیل ہیں؟ پھر اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے رب سے بے نیاز ہو جائے اور اس نعمت سے منہ پھیر لے جو اس کی زندگی میں اس کے لئے توفیق و رہنمائی کی سب سے بڑی روشنی ہے تو اسکی محرومیوں کا کیا حال ہوگا!

ان دلائل کے بعد کلام ان دلائل کی طرف متوجہ ہو گیا ہے جو انسان اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اور جن سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ وہ خدا کا مخلوق بندہ ہے اور اسی کی بخشی ہوئی روزی سے پلتا ہے۔ اور انکے ذکر کا منشاء محض یہ ہے کہ انسان کی نافرمانی اور ناشکری کی شناعت پوری طرح واضح ہو جائے۔

فرمایا:۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ (۲۳) فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (۲۴) أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۲۶) فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا (۲۷) وَعِنَبًا وَقَضْبًا (۲۸) وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا (۲۹) وَحَدَائِقَ غُلْبًا (۳۰) وَفَاكِهَةً وَأَبًّا (۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲)

ہرگز اس نے پورا نہ کیا جو اس نے فرمایا (۲۳) انسان اپنی غذا پر نگاہ کرے (۲۴) ہم نے پانی کو گرایا (۲۵) پھر زمین کو پھاڑا (۲۶) پھر اسمیں اگائے اناج (۲۷) اور انگور اور ساگ (۲۸) زیتون اور کھجور (۲۹) گھنے باغ (۳۰) اور میوے اور دوب (۳۱) تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے برتنے کے لئے (۳۲)

۱۰- الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

[کَلَّا] انسان کی بے پروائی اور نافرمانی پر زجر و تنبیہ ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہو جاتی ہے۔

[لما یقض] یعنی اپنی نافرمانی کی حالت پر برابر قائم ہے۔

[ما امر] یہ فطرت کے الہام اور وحی و تنزیل دونوں کو عام ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں شکر گذاری اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ الہام فرمایا ہے اور انبیاء کے واسطہ سے جو اوامر و نواہی بھیجے ہیں، سب اس کے تحت میں آجائینگے۔

[انا] یہ اور اس کے بعد کے جملے طعام سے بدل کے محل میں واقع ہیں۔ یعنی انسان ان تمام چیزوں پر نگاہ کرے۔

[صببنا الماء صبا] بہت زیادہ پانی بہایا۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجا۔

[وشققنا الارض شقا] شق کا لفظ زمین کے لئے مختلف اعتبارات سے استعمال کیا گیا۔ (۱) جب بارش ہوتی ہے زمین کے مسامات اس کو پی لینے کے لئے کھل جاتے ہیں۔ (۲) زمین کو پھاڑ کر اللہ تعالیٰ نے اس میں نہریں اور

جوہری وغیرہ کا خیال ہے کہ ابان مادہ ابن سے بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابنہ بشیٔ کے معنی ہیں۔ اس کو کسی بات کی تہمت لگائی۔ یہ انبہ سے ہے جو اس گرہ کے لئے بولا جاتا ہے جو لکڑی میں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اب سے فعلان کا صیغہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان نہایت گہری معنوی مناسبت موجود ہے۔ یہ مادہ عبرانی زبان میں بعینہٖ اسی معنی میں پایا جاتا ہے אבב (اب ب) אב (اب) ترکاری اور پھل אביב۔ (ابیب) سبز بالی اور یہودیوں کے پہلے مہینہ ربیع کے لئے مستعمل ہے۔ اس لئے کہ وہ نباتات کی روئدگی اور نمو کا اولین مہینہ ہے۔ اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ یہ مادہ عربی زبان میں مستعمل ہے۔ لیکن اشعار میں اس کا استعمال کم ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت میں اس کے نہایت ہلکے مترادفات موجود تھے۔ لیکن جہاں ایک جامع لفظ کا استعمال ناگزیر اور حسن موقع مقتضی ہوا یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ یہاں مختلف وجوہ مقتضی تھے کہ یہی لفظ استعمال کیا جائے۔ اگلی فصل میں اس کی تفصیل آئیگی۔ پس یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس لفظ سے ناواقف تھے۔ اس روایت کا پہلا حصہ منقطع ہے اور دوسرا حصہ مضطرب۔ اور وجوہ ذیل اس بات پر نہایت واضح

دلیل ہیں کہ یہ بالکل ضعیف ہے۔

۱۔ یہ سورہ مکی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہؓ کا اصلی مشغلہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا تھا۔ اگر یہ لفظ ان کو معلوم نہ تھا تو اس قدر طویل صحبت کے باوجود انھوں نے اسکو آنحضرت صلعم سے کیوں نہیں دریافت کیا۔ اور آنحضرت صلعم نے ان کو کیوں نہیں بتایا؟ کیا صحابہؓ قرآن مجید سے بالکل غافل تھے کہ جب آنحضرت صلعم کی وفات ہو چکی تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ لفظ بغیر تحقیق کے رہ گیا۔ اور اس وقت ان کو اس کے عدم علم کا اعتراف کرنا پڑا!

۲۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت واضح اور سہل ہے۔ اشعار اور خطبات کی جو عام زبان تھی اسی زبان میں نازل ہوا۔ پھر عکاظ میں شعراء کے جو کلام پیش ہوتے، ان کے حسن و قبح کا فیصلہ قریش ہی کرتے۔ حضرت ابو بکرؓ کا شمار عرب کے مشہور سرداروں اور خطیبوں میں تھا اور حضرت عمرؓ تو گویا قریش کی زبان اور ان کے ترجمان تھے۔ کلام پر ان کی تنقیدیں معلوم ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے معاملہ میں ان کا رتبہ کس قدر بلند تھا۔ پھر حیرت ہے کہ یہ ماہرین ادب و لغت قرآن مجید کے ایک لفظ سے بالکل بے خبر تھے۔

قرآن مجید عرب کی نہایت معروف اور کھلی ہوئی زبان میں اترا تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ دین کی دعوت دی جائے اور لوگ اسکی تعلیمات کو سمجھیں، اس بات کو خود قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ۔ ایک دوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ ہم نے اس کو بنایا عربی قرآن تاکہ تم اس کو سمجھو۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید ایسے الفاظ استعمال کرے جن کے معانی پر بڑے بڑے صحابہ نہ مطلع ہو سکیں؟ یہ بات تو اس کے عربی مبین ہونے کے صریح منافی ہو گی!

۲۔ جن لوگوں نے یہ روایت گڑھی ہے انھوں نے اس کو اکابر صحابہ رضؓ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ جو لوگ صحابہ پر طعن کے شائق تھے وہ بیشتر بڑے صحابہ ہی کو تاکتے تھے۔

[متاعًا] متاع اصل میں مصدر ہے۔ پھر یہ بطور اسم ہر اس چیز پر استعمال ہونے لگا جو برتی جائے۔ یہیں سے ساز و سامان اور سرمایہ کے لیے بولا جانے لگا۔ اس لفظ کے اندر قلت مدت کا مفہوم بھی چھپا ہوا ہے۔ کبھی تو یہ

مفہوم تصریح کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس میں مقدر ہونے کی وجہ سے نہیں ظاہر کیا جاتا۔ یہ بات قرآن مجید کے استعمالات سے بالکل واضح ہے۔ مَتَاعٌ فِی الدُّنیا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ یعنی تھوڑے دنوں کے لیے دنیا کی زندگی میں برتنا ہے۔ پھر ہمارے پاس لوٹائے جائینگے۔ پس یہاں مَتَاعًا لَّکُمْ میں دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مصدر مانا جائے جیسا کہ یُمَتِّعْکُمْ مَتَاعًا حَسَنًا اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی میں ہم پاتے ہیں۔ اس شکل میں تاویل یہ ہوگی کہ یہ چیزیں ہم نے اسلیے پیدا کی ہیں کہ تم کو ان سے بہرہ مند کریں، دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو حال مانا جائے یعنی درانحالیکہ یہ چیزیں تمھارے برتنے کے لیے ہیں لیکن باعتبار نتیجہ دونوں تاویلیں یکساں ہیں البتہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور انعام کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ انسان کو بہرہ مند کرنے کے لیے بنایا ہے۔

اشیائے مذکورہ میں باہمی ترتیب و مناسبت

اس سورہ سے پہلے کی تین سورتوں میں ان آیات کی مثالیں تھیں مل سکتی ہیں، ان پر ایک نگاہ ڈال لو۔ یہ چاروں سورتیں اپنے

مضامین کے اعتبار سے نہایت ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ صرف اسلوب اور نہج کا فرق ہے۔ موقع کی رعایت سے ایجاز تفصیل اور ترتیب کے ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اس سورہ میں اقتضائے مقام سے جو ترتیب ملحوظ ہے چند لفظوں میں ہم اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں جیسا کہ واضح ہوگا الاقدم فالاقدم کا اصول اختیار کیا گیا۔ یعنی ضرورت کے اعتبار سے جو شے جسقدر زیادہ نمایاں اور اہم تھی، ترتیب میں اسکو اسی قدر اہم اور نمایاں جگہ ملی اور ایجاز و اختصار کی انتہائی رعایت کیساتھ تفصیل اور استقصاء کا اسلوب ملحوظ رکھا گیا۔ چنانچہ پہلے ان چیزوں کا ذکر کیا، جو سیرابی کی زیادہ محتاج ہیں اور جن سے انسان کو جلد رزق حاصل ہوتا ہے۔ اگر بارش بکثرت نہ ہو تو یہ چیزیں وجود میں نہ آسکیں اور ان سے انسان محروم ہو جائے۔ حالانکہ انسان کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر انہی چیزوں پر ہے۔ یہ چیزیں تین قسم کی ہیں۔ غلہ، پھل، سبزیاں اور ترکاریاں۔ پس ان میں سے سب سے پہلے اناج کا ذکر کیا۔ یہ انسان کے سامان معیشت کا سب سے زیادہ جامع عنصر اور ذخیرہ کی چیزوں میں سب سے اہم ہے۔ پھر انگور کا ذکر کیا جو راس الاثمار ہے۔ نیز ذبیب کی صورت میں ذخیرہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور نبیذ کی صورت میں ایک صالح اور

اور طیب شراب ہے۔ عرب ان اشیار کی اس قدرتی ترتیب سے واقف تھے۔ اعشیٰ قیس کا شعر ہے:۔

فاروی الزروع واعنابھا علیٰ سعة ماءھا اذ قسم

اس شعر میں اس نے اناج کے بعد انگور کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ معیشت کی ضروری چیزوں میں جو جذبہ اہتمام وہ ان چیزوں کے لئے اپنے اندر رکھتے تھے وہ دوسری چیزوں کے لئے نہیں رکھتے تھے۔

اس کے بعد 'قضب' کا ذکر کیا۔ یہ ان تمام چیزوں کے لئے ایک جامع اسم ہے جو تروتازہ اور کچی حالت میں کھائی جائیں۔ قرآن مجید میں قریب قریب یہی ترتیب بعض اور مقامات میں بھی ملحوظ ہے۔ مثلاً فرمایا:۔ لنخرج بہ حبا و نباتا، تاکہ ہم اس کے ذریعہ اگائیں اناج اور نباتات۔ قضب پر ان چیزوں کا بیان ختم ہو جاتا ہے جو جلد نفع پہنچانے والی اور زیادہ سیرابی و آبپاشی کی محتاج ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اولاً تو بدیر پھل لاتی ہیں ثانیاً سیرابی اور آبپاشی کی کچھ ایسی محتاج نہیں ہوتیں عموماً صرف آسمان کی بارش ان کے لئے کفایت کر جاتی ہے۔ مثلاً عام درخت ان میں زیتون کو سب پر مقدم رکھا۔ اولاً تو اس کے مبارک اور مثمر ہونے کی

کی وجہ سے، ثانیاً اس کی بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے جن کا ذکر ہم آگے کریں گے اسکے بعد نخل یعنی کھجور کا ذکر فرمایا۔ یہ اہل عرب کے لئے اپنے اندر غذا اور لذت دونوں کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ یہ ان کے لئے اناج بھی ہے اور انگور بھی۔ پھر اسی سلسلہ میں تمام پھل والے بڑی قسم کے درختوں کا ذکر کرکے اس دوسری نوع کی چیزوں کا بیان ختم کر دیا۔

جس ترتیب کے ساتھ ان چیزوں کا بیان قرآن مجید میں آیا ہے۔ بالکل اسی ترتیب کے ساتھ تورات میں بھی آیا ہے۔ اس میں بھی زمین کی اہم پیداوار دل کا جہاں ذکر ہوا ہے، اناج، انگور، زیتون کا بیان بترتیب ملتا ہے۔ (دیکھو تثنیہ باب ۲۴: ۱۹-۲۱ و باب ۲۸: ۳۸-۴۰) البتہ کھجور کا ذکر چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ شام کھجور کی پیداوار کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہ عرب کی مخصوص چیز ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کے ملک کی اصلی پیداوار یہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر اناج کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا:- فی جنت وعیون وزروع ونخل طلعھا ھضیم۔ دوسری جگہ فرمایا:- ونزلنا من السماء ماء مبارکاً فانبتنا بہ جنت وحب الحصید والنخل باسقت لھا طلع نضید۔ ایک جگہ فرمایا:- وجنت من

اعناب وزرع ونخیل۔

غرض ان دونوں میں وہ تمام چیزیں سمٹ گئی ہیں جن کو انسان بوتا اور لگاتا ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری جامع نوع کا بیان کیا جس کے دو لفظوں میں زمین کی تمام باقی نباتات آگئیں یعنی فاکہہ اور ابّ۔ ان میں سے ایک انسان کے لئے ہے۔ دوسری چوپایوں کے لیے ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح بھی فرمادی۔ متاعا لکم ولانعامکم۔ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لئے۔ یہ ایک مخصوص اسلوب ہے جو کسی سلسلہ کے بعد بطور استدراک اس لئے نمایاں ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ تمام چیزوں کو سمیٹ کر تکمیل کی مہر لگادے۔ قرآنمجید میں اس جامع اسلوب کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا بما تبصرون وما لا تبصرون۔ ایک جگہ بہت سے انبیاء کا نام ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔ ورسلا قد قصصنہم علیک بہت سے انبیاء ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو سنادیئے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنائے۔ اسی طرح بہت سے بارکش جانوروں مثلاً گھوڑے، خچر، اور گدھے وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا ویخلق ما لا تعلمون اور بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔

آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے

اس تذکیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اور ہمارے چار پایوں کو جو روزی مل رہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ پس ہمارا تمام تر انحصار اسی کی ذات پر ہے۔ وہی ہے جس نے حیوانات کو ہمارا محکوم اور خدمت گار بنا دیا ہے اور جس طرح ہم خدا کے بخشے ہوئے رزق سے پلتے ہیں، اسی طرح وہ بھی خدا کے خزانہ جود سے روزی پاتے ہیں۔ پس یہ کیسی بدبختی اور شقاوت کی بات ہے کہ ان انعامات و افضال کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی کریں۔

اس تعلیم کی نظیر پچھلی سورہ میں گزر چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہم اسکا صرف اتنا حصہ بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے ان آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے واضح ہو جائے۔ تمام تفصیلات کو دوبارہ دہرانا غیر ضروری ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ٹکڑوں میں ایک بات بطور قدر مشترک کے موجود ہے۔ یعنی ان میں انسان کی بے پروائی اور اسکے تمرد پر اس کو سرزنش کی گئی ہے لیکن دونوں میں سرزنش کے پہلو کسی

کسی قدر مختلف ہو گئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں انسان کے کفر و انکار پر سرزنش ہے۔ اور اس دوسرے ٹکڑے میں اس کی نافرمانی اور ناشکری کا پہلو پیش نظر ہے اور ساتھ ہی ان میں اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور قیامت کے دن اٹھائے جانے کی ایسی دلیلیں بھی چھپی ہوئی ہیں جن سے ایمان بالجزاء کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

علاوہ بریں ایک اور بھی پہلو پیش نظر رکھیے۔ ان آیات میں آسائش و معیشت کے جن سامانوں اور نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ دنیاوی زیست کی زندگی کی ایک نہایت جامع مثل ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے ذیل کی آیت پر تدبر کرنا چاہیے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ	اے لوگو تمہاری سرکشی کا وبال
عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ	تمہاری ہی جانوں پر پڑیگا دنیا
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا	کی چند روزہ زندگی کے مزے اڑالو
مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ	پھر ہماری طرف تم کو لوٹنا ہے اور ہم
تَعْمَلُوْنَ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ	تم کو خبر دینگے ان چیزوں کی جو تم کرتے
الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ	رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کی مثال تو

مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ	بھی ایسی ہے کہ جسطرح پانی کہ جسکو
نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ	ہم نے برسایا آسمان سے پس زمین کی
النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰیٓ	نباتات جن کو آدمی اور چارپائے کھاتے
اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ	ہیں اس سے اگیں۔ یہانتک کہ جب زمین نے
زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ	اپنا سنگار کر لیا اور وہ خوشنما ہو گئی اور اسکے
اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ	مالکوں نے سمجھا کہ وہ اب اس پر قادر ہیں
عَلَیْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَیْلًا	آیا ہمارا حکم اس پر رات کے وقت یا دن کے
اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا	وقت پس ہم نے اس طرح اس کا ستھراؤ
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ	کر دیا گویا کل وہ کچھ تھی ہی نہیں۔ ایسی
كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ	ہی ہم اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں سوچنے
لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ	والوں کے لیے۔

چنانچہ اس مقام کی اسی پوشیدہ حقیقت کے اقتضاء سے اس کے بعد قیامت اور روز جزا کا بیان شروع ہو گیا۔

ان آیات کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں ترغیب و ترہیب کے لیے آتی ہیں۔ ان میں بھی استدلال کا زور پوری طرح موجود

ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن کا نہایت عام اسلوب ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ (۳۴) وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ (۳۵) وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ (۳۶) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (۳۷) وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۳۸) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۳۹) وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (۴۰) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۴۱) أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۴۲)

پھر جب وہ سخت آواز آئے گی (۳۳) جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا (۳۴) اور اپنے ماں باپ (۳۵) اور اپنی بیوی اور بیٹے سے (۳۶) اس روز ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی (۳۷) بہت سے چہرے اس روز روشن ہونگے (۳۸) ہنستے اور خوش ہوتے (۳۹) اور بہت سے چہروں پر اس روز خاک اڑتی ہوگی (۴۱) یہی ہوں گے کافر اور بدکار لوگ (۴۲)

۱۳- الفاظ او جملوں کی تاویل

از آیت ۳۳- تا ۴۲

[الصاخہ] عربی میں "صخ سمعہ" کے معنی ہوں گے "اصمہ" یعنی اس کے کان بہرے کر دیئے۔ پس قیامت کے لئے صاخۃ (بہری کر دینے والی آواز) کا لفظ اس کی دو مخصوص حالتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک تو اس کی اس اولین سخت و شدید کڑک کی طرف جو کانوں کو بہرا کر دینے والی ہو گی۔ دوسرے اس کی اس ہولناکی کی طرف جو ہر شخص کو اس کے نفس کے سوا ہر چیز سے غافل کر دے گی۔ قیامت کی اس حالت کی تصویر بعض آیات میں کھینچی گئی ہے۔ یوم تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملھا وترى الناس سکاریٰ۔ اور عربی زبان میں جب کسی بڑی مصیبت کی شدت بیان کرنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ "لا یتنادی ولیدھا" ایسی سخت کہ مائیں اپنے بچوں کو بھول گئیں۔ پس صاخۃ کے لفظ میں قیامت کی یہ دونوں حالتیں بیان ہوئی ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ پہلے مفہوم میں بالکل واضح تھا اس لئے قرآن نے اس کی کوئی تفصیل نہیں کی لیکن دوسرے مفہوم کی طرف بغیر کسی اشارہ کے بے تکلف ذہن نہیں

منتقل ہو سکتا تھا۔ اس لئے قرآن نے یوم یفر المرء الآیۃ سے لیکر لکل امرئ منهم یومئذ شان یغنیه تک اس کی تشریح کی۔

[یفر] یہ قیامت کی ہولناکی کے لئے ایک پر کنایہ طریق تعبیر ہے۔ یہ دن ایسا ہو گا کہ ہر شخص کو صرف اپنی پڑی ہو گی۔ دوسروں کی حالت کی طرف توجہ کرنے کے لئے اس کو فرصت نہ ملے گی۔ اس کے بعد کے جملوں میں اسکی پوری تشریح ہو گئی ہے۔

[مسفرۃ] یہ "اسفر الصبح" سے لیا گیا ہے یعنی روشن، تابناک۔ مسرت کی پہلی تابناکی جو اہل جنت کے چہروں پر نمایاں ہو گی۔ یہ لفظ اس کو ظاہر کر رہا ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہو گئی ہے۔

[ضاحکۃ] یہ مسرت سے کنایہ ہے۔ چنانچہ بعد کے لفظ نے اس کو کھولدیا۔ اہل ایمان کو امن و سلامتی اور قرب و وصال کی دولت پا کر جو بشاشت ہو گی اس کو ضحک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[مستبشرۃ] اس لفظ نے معاملہ کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو اہل جنت کے لئے تیار ہوں گی ان کو دیکھ کر جو بشاشت یقیناً انکے چہروں پر نمایاں ہو گی، یہ لفظ اس کو ظاہر کر رہا ہے۔

[علیہا غبرۃ] یہ مسفرۃ کا مقابل اور ذلت وغم سے کنایہ ہے یہ کنایہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر موجود ہے ولا یرھق وجوھھم قتر ولا ذلۃ۔ امرا القیس نے بھی اس کنایہ کو استعمال کیا ہے۔

علیہ القتام سئی الظن والبال

[ترھقھا قترۃ] ان پر سیاہی چھا رہی ہوگی —— یہ لفظ غبرۃ سے زیادہ سخت ہے یعنی پہلے ان پر خاک اڑے گی۔ پھر سیاہی چھائیگی علیہا غبرۃ ترھقھا قترۃ ٹھیک ٹھیک مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ کا مقابل ہے۔ اس تقابل کی مثال دوسری جگہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ۔

[الکفرۃ الفجرۃ] اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے منکر، اسکی نعمتوں کے ناشکر گذار، اس کے حکموں سے بغاوت کرنے والے —— اس سے اوپر انسان کے کفر و ناسپاسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، ان دو لفظوں کے اندر اسی تفصیل کو سمیٹ دیا ہے۔

(۱۴) ایک لطیف نکتہ

قرآن مجید جن چیزوں کو بیان کرتا ہے ان کی باہمی ترتیب میں ایک خاص حکمت مرعی ہوتی ہے۔ ہم یہاں اسی طرح کے ایک حکیمانہ نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس سورہ میں غور کروگے تو یہ بات نظر آئے گی کہ اس میں اللہ تعالےٰ نے انسان کی صفات خیر و شر کو مقابلہ کے اصول پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صفات خیر میں تزکی، تذکر اور خشیت کو بیان فرمایا ہے۔ اور صفات شر میں سے استغنا، کفر اور فجور کو۔ پہلے تزکی، تذکر، خشیت کی تینوں حالتوں پر غور کرو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اوپر سے نیچے اترنے والی ترتیب ملحوظ ہے۔ تزکی خشیت کی آخری منزل ہے، اس کو پہلے بیان فرمایا ہے اور خشیت کو جو اس راہ کا نقطۂ آغاز ہے سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان و تقویٰ کا سفر ایک متعین منزل مقصود کی طرف ہوتا ہے، اس لئے سفر کے آغاز ہی میں منزل مقصود ان کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ لنگر اٹھانے

سے پہلے ساحل کی سمت ٹھہرا لیتے ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ قرآن مجید بیان میں ایسی ترتیب اختیار فرمائے جو اہل ایمان و تقویٰ کی اس ذہنی حالت کو بے نقاب کر دے۔

برعکس اس کے صفات شر کے بیان میں ترتیب بالکل دوسری ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر چڑھنے والی ترتیب ہے۔ یعنی استغناء شقاوت کا پہلا زینہ ہے۔ اس کو پہلے بیان کیا۔ اور فجور بالکل آخری حالت ہے اس کو سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کفر و فسق اپنی آخری منزل سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نفس کے اشارہ سے قدم اٹھا دیتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ بالآخر آہستہ آہستہ اس قعر ہلاکت تک پہنچ جاتے ہیں جو ایسے لوگوں کے لئے مقدر ہے۔

یہ نکتہ تھا جس کی وجہ سے دونوں ترتیبوں میں اختلاف ہوا۔ اب دونوں ترتیبوں کے تدریجی لزوم پر غور کرو۔ پہلے خشیت ہے اس لئے کہ یہ تمام فوز و فلاح کی اصل ہے۔ یہ آدمی کو تذکر پر ابھارتی ہے اور تذکر تزکیہ کی طرف رہبری کرتا ہے۔ جو اصل مقصود ہے۔ دوسری میں استغنا سب سے مقدم ہے کیونکہ یہ تمام فساد کی جڑ ہے۔ یہ انکار حق پر آمادہ کرتا ہے اور انکار حق، فجر

کا دروازہ ہے۔

ہم نے جو ترتیب بیان کی ہے، اگر ہم چاہیں تو اس پر قرآن مجید سے بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہماری اس کتاب میں اسکے شواہد ایک سے زیادہ مقامات میں گذر چکے ہیں۔ اہل نظر خود بخود اس پر پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے۔

۱۵- پوری سورہ کے نظم پر ایک اجمالی نظر

پچھلے مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس سورہ کے ابتدائی حصہ میں کافروں اور فاسقوں پر بطریق تعریض تشنیع کی گئی ہے تاکہ ان کی غفلت کی نیند ٹوٹے اور وہ آنکھیں کھولیں۔ یہ مضمون ابتدائی دس آیتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی عظمت و منزلت کا بیان شروع ہوتا ہے کہ وہ پاک اور بلند ہے۔ عزت والے فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں پر فضل و احسان فرمانے کے لئے اس کو اتارا ہے پس وہی لوگ اس کے مستحق ہو سکتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں۔ ان ناقدروں اور منکروں کے لئے یہ نعمت گرانمایہ نہیں ہے۔

یہ مضمون سولہویں آیت تک آتا ہے۔ اس کے بعد دو فقرے[۵۱] ہیں۔ ان میں اپنی نعمتوں اور قدرت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جس سے انسان کا ضعف و فقر واضح ہو تاکہ اس کے کفر و نافرمانی کی شناعت پوری طرح بے نقاب ہو جائے۔ پہلے فقرے میں ان نعمتوں کو بیان فرمایا ہے جو انسان اپنے نفس کے اندر پاتا ہے یہ فقرہ بائیسویں آیت پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے فقرے میں وہ نعمتیں بیان ہوئی ہیں جو اس دنیا میں انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جن پر اسکی زندگی اور بقا کا دار مدار ہے۔ یہ فقرہ بتیسویں آیت تک آتا ہے۔ پہلے فقرہ کو قتل الانسان ما اکفرہ سے شروع کیا اور دوسرے کو کلا لما یقض ما امرہ سے ان دونوں کو بترتیب پیش نظر رکھو تو خلاصہ مطلب یہ نکلے گا کہ اس انسان کے کفر کا معاملہ کتنا عجیب ہے جسکا وجود خود، اس کی بندگی، اس کے ضعف و عجز، اس کے فقر و احتیاج اور پھر بعث و قیامت اور حساب و جزا پر سب سے بڑی حجت ہے اور اسکی ناسپاسی اور بدعملی کسقدر قابل ملامت ہے جس کے وجود اور زندگی کا

---

[۵۱] یہ لفظ پیراگراف کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ مصنفؒ نے اس کے لئے جملہ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی چند آیتوں کا مجموعہ۔ (مترجم)

ایک ایک ریشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نوازشوں سے پل رہا ہے اور وہ ان تمام باتوں کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے پس کفر اور جحود یعنی ناسپاسی اور انکار دونوں کا ذکر یہاں ایک ساتھ بالکل اس اصول کے مطابق ہوا ہے جس اصول کے مطابق ایمان اور عمل صالح کا ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے یہ بالکل عقلی ترتیب ہے، کیونکہ اعمال سرتاسر عقائد اور اخلاق کے تابع ہیں۔

قرآن مجید نے اس اصول کی طرف جابجا اشارات کئے ہیں۔

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ، فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ	بھلا دیکھو تو اس کو جو روز جزار کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

یعنی یتیم کو دھکے دینے کی شقاوت اس میں اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ وہ جزار کے دن کا منکر ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یتیم کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا۔ قرآن مجید میں مختلف پیرایوں سے یہ اصول بار بار بیان ہوا ہے۔

اب ان دونوں فقروں کے خلاصہ مفہوم کو پھر ایک مرتبہ سمجھ لو کہ انسان کا معاملہ عجیب ہے، وہ اپنے ظاہر و باطن کو خدا کی بے شمار نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے، پھر بھی نہایت بے پروائی کے ساتھ، اس بات کا منکر ہے

کہ وہ ایک دن اپنے کاموں کی جواب دہی کے لیے اٹھایا جائے گا! یہ کفر
و ناسپاسی کی ایک بالکل ہی انوکھی اور حیرت میں ڈال دینے والی حالت
ہے! آخر وہ کس چیز کا منکر ہے؟ کیا اس کی ان بے شمار نعمتوں کا جس کی شہادت
اس کے وجود کے ریشہ ریشہ کے اندر سے بول رہی ہے؟ کیا اس کی اس چنبھے
میں ڈال دینے والی قدرت کا جس کے عجائب سے اس کائنات کا کوئی گوشہ
خالی نہیں؟ پھر جب یہ دونوں باتیں موجود ہیں، اور ان میں کسی ایک سے
بھی اس کو انکار نہیں۔ تو پھر اس کو بدلہ اور مکافات کے ایک ناگزیر اور
اٹل دن سے کیوں انکار ہو! وہ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی نعمتوں
اور قدرتوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی
نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھائے لیکن ذمہ داری اور مسئولیت کا کوئی
بار نہ اٹھائے! اس کی بخششوں کے خوان کرم پر عیش کرے اور پھر اس کے
حکموں کو پوری بیہودگی کے ساتھ ٹھکرائے! یہ کفر و جحود کی کیسی عجیب
شقاوت ہے جو بدبخت انسان نے اختیار کر لی ہے!!

انسان کی شقاوت کے یہ دونوں گوشے جو اب تک تمھیں بیان میں پھیلے
ہوئے نظر آتے ہیں، سورہ کے آخر میں آ کر بالکل ایک نقطہ پر سمٹ گئے ہیں۔

فرمایا اولئک ھم الکفرۃ الفجرۃ۔

انسان کے موجودہ فقر و احتیاج اور اس کے اوپر اپنے افضال و عنایات اور اپنی قدرت کو بیان کرنے کے بعد اس کے اس فقر و احتیاج کو بیان فرمایا جس سے وہ زندگی کے بعد دوچار ہوگا جبکہ موجودہ سروسامان معیشت کی تمام خوش عیشیاں، جو آج غفلت و مدہوشی کا باعث ہیں ختم ہو چکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ مضمون شروع ہوا اور یہ آیت ۷۳ تک آیا۔ اور جس طرح پہلے فقرہ میں بعث کے ذکر کے ساتھ ایسی چیزیں بیان ہوئیں جو بعث پر دلیل تھیں اسی طرح قیامت کے ذکر کے ساتھ ایسے امور کا بیان ہوا جو قیامت پر دلیل ہیں۔ چنانچہ انسان کی خلقت کے ذکر کے بعد جس طرح فرمایا فاذا شاء انشرہ۔ اسی طرح اس کے رزق کے بیان کے بعد فرمایا فاذا جاءت الصاخۃ کیونکہ انسان جب اپنی خلقت کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائیگی کہ جو خدا اس کو پیدا کر سکتا ہے، وہ اسکو دوبارہ اٹھا بھی سکتا ہے۔ اسیطرح جب وہ ہنجو ربّ کے انعامات کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس میں اس امر کا یقین تازہ ہوگا کہ اس کے سامنے مسؤلیت اور بازپرس کا بھی ایک دن آئے گا اور اسے اپنے مولیٰ اور پروردگار کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ سورہ مرسلات

میں اس اسلوب کی نہایت عمدہ مثال موجود ہے۔

أَلَمْ نَخْلُقكُّم مِّن مَّاءٍ
مَّهِينٍ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ
مَّكِينٍ إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ
فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ
أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا
أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا وَجَعَلْنَا
فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَ
أَسْقَيْنَاكُم مَّاءً فُرَاتًا وَيْلٌ
يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ

کیا ہم نے تم کو ایک بے حقیقت پانی سے نہیں
بنایا؟ اور پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا
ایک مقررہ زمانہ تک، ہم نے مقرر کیا، کیا خوب
ہم مقرر کرتے ہیں۔ آج منکرون کی خرابی ہے۔
(یعنی بعث کے منکروں کی) کیا ہم نے زمین کو
سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ زندہ کو اور مردہ کو اور اس میں
گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے اور تمھیں
خوشگوار پانی پلایا۔ آج منکروں کی خرابی ہے
(یعنی روز جزا کے منکروں کی)

. . . .

دوسرے مقامات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔

انسان کے فقر و احتیاج اور اس کے کفر و فجر اور استغناء کی شناعت بیان کرنے کے بعد دونوں فریق یعنی ارباب خشیت و تقویٰ اور اہل کفر و فجر کے مآل اور انجام کے بیان پر سورہ کو ختم کیا اور انہی کے بیان سے سورہ شروع ہوئی

تھی۔ یہ مضمون آیت ۲۴ پر ختم ہوتا ہے جو سورہ کی آخری آیت ہے۔
اب پوری سورہ پر غور کر کے دیکھو کہ چند آیتوں کے اندر انسان کی بے پروائی اور کفر و انکار کی حالت اور اس کے ضعف و احتیاج کی بے بسی اور اللہ تعالےٰ کے افضال و عنایات کی داستان کس خوبی و بلاغت اور اعجاز کے ساتھ بیان ہو گئی ہے۔ اور کس طرح یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے خود بخود یہ مترشح ہو رہا ہے کہ اس میں آنحضرت صلعم کو تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ کہ آپ ان بے پروا اشقیاء کو چھوڑ کر صرف ان لوگوں کو اپنی تمام توجہ اور شفقت کا مرکز بنائیں جو اس نعمت عظمیٰ کے مستحق ہیں۔

ھذا آخر ما تیسر لنا ذکرہ فی ھذا المقام والحمد للہ رب العلمین والصلوۃ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

*

*

سلسلۂ دائرۂ حمیدیہ نمبر ۱۶

تفسیر سورۂ مرسلات

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

سلسلۂ دائرۂ حمیدیہ نمبر ۱۶

تفسیر سورۂ مرسلات

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

مکتبہ الفرقان بریلی
سے ہر قسم کی مذہبی کتابیں نہایت سستی ملتی ہیں

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

قیمت

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ
۱۔	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے اس کا تعلق۔	۲
۲۔	سورہ کے مواقع ترجیع کے متعلق ایک اصولی بحث۔	۴
۳	لفظوں کی تفسیر اور بعض جملوں کی تاویل۔	۸
۴۔	ہواؤں کی شہادت اور آیات کا نظم و موقع۔	۱۵
۵۔	الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل۔	۲۱
۶	ان آیات کی تفسیر اور ان کا نظم اور معاد پر ان کی حجت	۲۴
۷۔	الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل۔	۳۳
۸۔	ظل ذی ثلث شعب سے ایک لطیف نکتہ۔	۳۶
۹۔	ان آیات کے نظم اور مواقع ترجیع پر ایک مجموعی نظر۔	۴۰
۱۰	الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل۔	۴۳
۱۱	آیات کی تاویل اور ان کا نظم۔	۴۷

(باہتمام منشی محمود علی، مطبع اصلاح سرائمیر اعظم گڈھ میں چھپی)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ فَالْعٰصِفٰتِ
عَصْفًا ۙ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ
فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ فَالْمُلْقِیٰتِ
ذِکْرًا ۙ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ اِنَّمَا
تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ فَاِذَا النُّجُوْمُ
طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ
وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ وَاِذَا الرُّسُلُ
اُقِّتَتْ ؕ لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ لِیَوْمِ
الْفَصْلِ ۚ وَمَاۤ اَدْرٰىکَ مَا یَوْمُ
الْفَصْلِ ؕ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ۙ

قسم ہواؤں کی کہ چھوڑ دی جاتی ہیں، پھر خاک
اڑاتی ہیں اور پھیلاتی ہیں، پھر پھاڑتی ہیں۔
پھر یاد دلاتی ہیں، الزام اتارنے کو یا ڈر
سنانے کو کہ جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے ضرور
ہوگا، جبکہ ستارے چھپ جائیں گے، اور
آسمان پھٹ جائے گا، اور پہاڑ اڑ جائیں گے
اور رسولوں کے لئے وقت مقرر ہوگا
کس دن پر یہ ٹالے گئے ہیں، فیصلہ کے
دن پر اور فیصلہ کے دن کو تو کیا سمجھا،
اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے اس کا تعلق

آخر قرآن کی سورتوں میں بیشتر ابتدائے دعوت کے بنیادی مسائل کا بیان ہے یعنی قیامت، خشیت اور احسان کا۔ چنانچہ اس سورہ کا عمود بھی یہی تین چیزیں ہیں۔ اور یہی تین ابتدائی نقطے ہیں جو پھیل کر دین کے تمام عناصر کو اپنے دائرہ میں لے لیتے ہیں۔ قیامت کا ڈر، ایمان بالقرآن کی اصل ہے، کیونکہ قرآن کی پہلی صدا یہی ہے۔ کہ وہ عدل وجزا اور ایک خوفناک دن کے ظہور کی منادی ہے۔ خشیت نماز اور توحید کی اصل ہے۔ اور تیسری چیز یعنی احسان الی الخلق، تمام قوانین و شرائع کی بنیاد ہے۔

یہ تمام باتیں قرآنمجید میں اپنے اپنے موقع سے، نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ، بیان ہوئی ہیں، اور اس سورہ میں بھی حسب اقتضائے موقع مختلف اسلوبوں سے ان کا ذکر آیا ہے اور موقع کے اختلاف کے ساتھ اسلوب کا اختلاف قرآن مجید کی ایک خاص خصوصیت ہے جس سے اہل نظر واقف نہیں، قرآنمجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خود اشارہ کیا ہے:۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا

اسی اصول پر اس عام عمود کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کسی میں کوئی پہلو نمایاں ہوا ہے، کسی میں کوئی۔ اور اسی لحاظ سے طرزِ خطاب بھی بدل بدل گیا ہے کہیں فکر و احساس کو بیدار کیا گیا ہے اور کہیں عقل اور دل کو دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں میں دلائل کے ساتھ ترغیب و ترہیب بھی حسبِ اقتضائے بلاغت مختلف شکلوں اور حیثیتوں میں نظر آتی ہے۔

اس معاملہ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس سورہ کو سابق سورہ کے ساتھ ملا کر پڑھو۔ سابق سورہ (سورہ دہر) میں معاد، قرآن، اور نماز کا ذکر ہوا تھا۔ غور سے دیکھو تو اس سورہ میں بھی ان چیزوں کا بیان ہوا ہے لیکن اسلوب بیان بدل گیا ہے۔ سابق سورہ میں جو پہلو مجمل رہ گئے تھے اس سورہ میں وہ پہلو تفصیل کی روشنی میں آگئے ہیں۔ سابق سورہ میں معاد پر جو استدلال تھا، چند لفظوں میں تھا، اس سورہ میں وہ بسط کے ساتھ ہے۔ سابق سورہ میں معاد کی تصویر کیلئے ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں کیا گیا تھا۔ اس سورہ میں زیادہ زور ترہیب کے پہلو پر ہے۔ اور انذار و تبشیر دونوں کو ساتھ ساتھ اور مساوی رکھنے کیلئے ایسا کرنا تقاضائے بلاغت و مصلحت دعوت کے عین مطابق تھا۔ خدا کے انبیاء ایک ہی ساتھ بشیر و نذیر دونوں ہوتے ہیں۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔

یہ اجمالی اشارات ہیں۔ ان دونوں سورتوں پر اگر پورا پورا تدبر کیا جائے تو ہم نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ اچھی طرح واضح ہو سکتے ہیں۔

۲۔ سورہ کے مواقع ترجیع کے متعلق ایک اصولی بحث

یہ سورہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کا فقرہ دس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اس اسلوب کی خصوصیات پوری تفصیل کے ساتھ سورہ رحمٰن میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک خاص امر کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ترجیع کی خوبی کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مواقع کے لحاظ سے بامعنی اور پوری طرح موزوں ہو۔ اور جو بات اس سے اوپر بیان ہوئی ہے اس سے پورا لگاؤ رکھتی ہو۔ اس اعتبار سے ترجیع کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وجوہ کی جامع ہو تاکہ مختلف مطالب کے ساتھ لگ سکے۔ چنانچہ یہ آیت (وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ) اپنے اندر مختلف پہلو رکھتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مختلف مواقع کیلئے ٹھیک ٹھیک موزوں ہو گئی ہے۔ اس کے اسلوب اور اس کے تین لفظوں میں کافی وسعت ہے۔ ذیل میں ہم اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) اس کا اسلوب ایسا ہے کہ اس میں انشاء اور خبر دونوں ہونے کی حیثیت علاوہ اور دونوں کا احتمال ہے۔ خبر کے پہلو کے لحاظ سے مقصد یا تو اس امر کا بیان ہوگا کہ ان منکرین کیلئے ہلاکت اور خرابی ثابت ہے مثلاً فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ پس ان کیلئے خرابی ہے اس چیز کے باعث

وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ جہاں ہاتھوں نے لکھا اور اس کے سبب جو وہ کماتے ہیں۔

یا ان کے اس قول کا بیان مقصود ہے جو قیامت کے دن کہیں گے۔ اور ان کا یہ قول قرآن مجید میں مختلف جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً قَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ دوسری جگہ ہے قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا۔

لفظ ویل کی بار بار تکرار میں بھی ایک خاص راز ہے۔ اگر اس سے اثبات ویل کا مفہوم سمجھا جائے تب تو اس تکرار کا یہ فائدہ ہوگا کہ اس سے اسباب ویل کی کثرت واضح ہوگی اور اگر یہ قیامت کے دن ان کے قول کی نقل ہی تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس دن اس کے بہت سے مواقع پیش آئیں گے اور وہ ہر موقع پر اپنی خرابی کا ماتم کریں گے۔ بعض آیات سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا:۔

وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا۔

اور جب وہ ڈالے جائیں گے اس کی کسی تنگ جگہ میں باندھکر، پکاریں گے اس وقت ہلاکی کو، آج ایک ہی ہلاکی کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکیوں کو پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دن ہلاکت کے اسباب اور مواقع دونوں ہی بیشمار ہونگے۔

(ب) لفظ ویل خود ایک جامع لفظ ہے، وہ تمام چیزیں اس کے تحت میں

آگئیں جو خرابی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ غم، حسرت، پریشانی، عذاب قیامت، ہر چیز پر یہ حاوی ہے بعض جگہ قرآن مجید میں اس چیز کی تصریح کر دیجاتی ہے جو ویل کا سبب ہوگی۔ مثلاً وَيْلٌ لِّلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ اور خرابی ہے کافروں کیلئے عذاب سخت کے سبب سے۔ دوسری جگہ ہے۔ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ پس خرابی ہے ان کیلئے اس چیز کے باعث جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور اس چیز کے سبب جو وہ کماتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ۔ پس ہلاکی ہے کافروں کیلئے انکے اس دن کے سبب جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

الغرض لفظ ویل کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ چونکہ اس کے اسباب بہت سے ہوں گے، اس لئے اس کے مواقع بھی بہت سے آئیں گے۔

(۲) یومئذ کا لفظ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس دن ایسا ایسا ہوگا، پس اس کے حدود کی تعیین موقع کے لحاظ سے ہوگی۔

(۵) مُکذبین کا لفظ ایک جامع لفظ ہے۔ اصلاً یہ بعث اور آیات توحید

کے انکار کیلئے آیا ہے، لیکن تفصیلات میں رسول اور کتاب اللہ کی تکذیب بھی
اس میں داخل ہی۔ قرآن مجید نے جا بجا ان تمام پہلوؤں کی تصریح کردی ہے اور
بعض آیات میں اس امر کو بھی واضح کردیا ہے کہ جو اصل کا منکر ہوگا وہ لازماً
اس کے فروع اور تفصیلات کا بھی منکر ہوگا۔ مثلاً فرمایا:-

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ	اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم ڈالدیتے ہیں تمہارے
وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	درمیان اور انکے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	رکھتے ایک مضبوط پردہ ہو ڈالدیتے ہیں ان کے دلوں
اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا	پر غلاف کہ اسکو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں
وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ	بہراپن پیدا کردیتے ہیں اور جب تم قرآن میں اللہ
وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا	کو تنہا یاد کرتے ہو تو یہ نفرت سے پیچھے بھاگتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ وہ قیامت اور توحید کے منکر ہیں اس لئے لازماً اس
چیز کا سننا بھی ان پر شاق ہے جو ان چیزوں کی طرف ان کو دعوت دیتی ہی۔ یہاں اجمالی
اشارہ کافی ہے۔ اپنے مقام پر پورے شرح و بسط کے ساتھ اسکی تفصیل موجود ہے۔
اس روشنی میں آیت ویل کا ظاہری اشارہ تو منکرین قیامت ہی کی طرف
ہوگا لیکن سورہ کی آیات اس کے ایک اور پہلو تکذیب قرآن کی طرف بھی اشارہ کررہی ہیں۔

او حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت کی ترجیح کے متعدد پہلو ہیں۔ پس سیاق و سباق سے جو پہلو زیادہ لگتا ہوا ہوگا، اختیار کر لیا جائے گا۔ یہ اصولی بحث بطور مقدمہ ذہن نشین رکھنی چاہیئے۔ ہم آگے موقع موقع کے اعتبار سے آیت کے مختلف پہلوؤں میں سے جو پہلو اقرب ہوگا اس کو بیان کر دیں گے۔

۳۔ لفظوں کی تفسیر و بعض جملوں کی تاویل

(۱ — ۱۵)

[والمرسلت عرفا] عربی میں ارسل الشیٔ امسکہ کا ضد ہے۔ ارسل الشیٔ کے معنی ہوئے کسی بندھی ہوئی چیز کو چھوڑ دیا، آزاد کر دیا۔ ہوا رکی ہوئی ہے تو گویا بندھی ہوئی ہے۔ جب چلنے لگی تو گویا چھوڑ دی گئی۔ فرمایا،

وارسلنا الریاح لواقح

[عرف] ناصیۃ الفرس میں گھوڑے کی ایال کے وہ بال جو پیشانی پر لٹکے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام اور متداول لفظ ہے۔ امرؤ القیس کا شعر ہے۔

نمش باعراف الجیاد اکفنا   اذا نحن قمنا عن شواء مضہب

جب ہم کارکا کچا پکا گوشت کھا کر اٹھتے تھے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنے ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔

یہاں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے چلنے اور رکنے کو گھوڑوں کی پیشانی کے بال پکڑنے اور چھوڑنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ ہواؤں کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ہوتا ہے، وہی مالک اور متصرف ہے۔ (وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا)

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہواؤں کا چلنا فائدہ و نقصان دونوں کیلئے ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

محض ارسال کا لفظ شدت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھا، اسلئے عاصفات کو اس حرف کے ذریعہ عطف کیا۔

[فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا] یعنی چلنے کے بعد سخت ہو جاتی ہے، ایسی ہوا عموماً نقصان کے لئے ہوتی ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ

یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انکو لیکر چلتی ہیں موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ چلتی ہے ان پر تند ہوا اور گھیر لیتی ہیں موجیں ہر طرف سے۔

[وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا] نشر کے معنی ہیں کسی چیز کو پھیلا دینا چھینٹ دینا،

برانگیختہ کر دینا، اگا دینا، یہ سب معنی قریب قریب ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف
معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے۔ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۔ دوسری
جگہ ہے۔ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ
ایک جگہ فرمایا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا یہاں ناشرات سے ہوائیں مراد ہیں۔
اسلئے کہ ان میں نشر کے مختلف پہلو پائے جاتے ہیں یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر فضا میں پھیلاتی
ہیں پھر اپنے رب کی رحمت کو چھینٹتی ہیں، اور نباتات کو اگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی رہتی
ہیں اور چونکہ یہ مستقل وصف تھا، صفت متعاقب نہ تھا اسلئے حرف عطف واؤ آیا۔

[فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا] ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں ـــ یعنی کبھی بارش
کو لا کر لاتی ہیں، کبھی بادلوں کو اڑا کر لیجاتی ہیں، کسی قوم کو نفع پہنچاتی ہیں، کسی
کو ضرر۔ سورہ ذاریات میں ہواؤں کے ان تصرفات کو آیت فَالْمُقَسِّمٰتِ
اَمْرًا کے تحت میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ چونکہ یہ فرق و امتیاز نشر کے بعد نمایاں
ہوتا ہے اس لئے عطف 'ف' کے ذریعہ سے ہوا۔

[فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا] قرآن مجید میں اکثر جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہواؤں
کی تصریف میں، اللہ تعالیٰ کی نشانی اور یاددہانی ہے۔ اسی سببیت کے تعلق
کی وجہ سے عام قاعدہ کے مطابق فعل کی نسبت ہواؤں کی طرف کر دی۔

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں اضلال کی نسبت اصنام کی طرف کردی گئی ہے۔

وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

اور مجھکو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بت پوجنے لگیں، میرے پروردگار ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔

پس ہواؤں کی تصریف کے بعد اس امر کو یاد دلایا کہ ہوائیں اللہ تعالے کی قدرت اور اس کے قانون قضاء بالحق کا اعلان کرتی ہیں۔

[عُذْرًا اَوْ نُذْرًا] یعنی یہ یاددہانی جو ہواؤں کی تصریف کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس کا مقصد غافلوں پر اتمام حجت اور ہوشیاروں کو انذار کا پیام پہنچانا ہے۔ "او" تقسیم کیلئے ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مصلحین کا قول نقل ہوا ہے۔ اس میں اس مفہوم کی تصریح ہوگئی ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ

اور جبکہ کہا ان سے ایک گروہ نے تم کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنکو اللہ ہلاک کرنیوالا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے۔ بولے تمھارے رب کے حضور میں معذرت کیلئے اور تاکہ وہ ڈریں

یعنی جو لوگ ہماری باتوں کو نہ مانیں گے ان کے حق میں ہماری طرف سے یہ معذرت ہوگی اور جو لوگ سنیں گے ان کو اس سے نفع پہنچے گا۔

[اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ] یہ ایک عام لفظ ہے، قیامت، بعث، فیصلہ اور روز جزاء کے متعلق جو وعدے کئے گئے ہیں، وہ سب اس میں آگئے، قرآن مجید میں اس کی جو نظیریں ہیں ان میں جگہ جگہ ان تمام چیزوں کی تصریح کر دی گئی ہے۔ اور چونکہ ان سب کی حقیقت ایک ہی ہے اس لئے یہاں اجمال کے ساتھ ان کو ذکر کر دیا، تفصیل نہیں فرمائی۔

[طُمِسَتْ] طمس الشیٔ کے معنی ہیں کسی چیز کو مٹا دیا، اس کے تمام نشانات و آثار محو کر دیئے۔ مثلاً فرمایا مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَا۔

[وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ] اس کے نظائر متعدد ہیں۔ مثلاً وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا۔ نیز وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ۔ اس کے معنی یہ ہوئے، وہ آسمان جو تمھیں بالکل ٹھوس اور سپاٹ نظر آتا ہے، جس میں کوئی شگاف یا دراڑ نہیں دکھائی دیتا۔ (وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ) (فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ) باوجود اس مضبوطی اور استحکام کے تم دیکھو گے کہ خدا کے حکم سے اس میں شگاف پڑ گئے ہیں۔

[وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ] نسف کے معنی ہیں ریزہ ریزہ کر دینا، منتشر کر دینا۔

ہیں دینا جھاڑ دینا۔ اسی سے منسا ف اس آلہ کو کہتے ہیں جو گیہوں کو بھس سے الگ کر دیتا ہے۔
قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے۔ وَانظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ
عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا۔ دوسری جگہ ہے وَيَسْأَلُونَكَ
عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا۔

[أُقِّتَتْ] وقتت کی تبدیل شدہ صورت ہے۔ جیسے وجوہ سے اجوہ۔
توقیت کے معنی ہیں وقت متعین کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کیلئے وقت متعین
کیا جائے گا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے۔ مثلاً بولیں گے۔ ابغنی خادما۔
ارسلنی فرسا اور مطلب یہ ہوگا کہ ابغ لی خادما وارسل الی فرسا۔ پس
آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انبیاء کیلئے حاضری کا ایک وقت متعین کیا جائے گا،
اور اس میں ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کیا جائے گا اور ان کی
شہادتوں کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ یہاں یہ مضمون مجمل صورت میں ہے۔ لیکن
دوسری آیت میں اس کی پوری تصریح ہو گئی ہے۔

[أَجَّلْتَ] اجل لہ۔ اس کے لئے ایک مدت ٹھہرا دی، ایک وقت
متعین کر دیا۔ فرمایا۔ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا (ہم اس مدت کو پہنچ گئے
جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرا دی تھی۔ اس کے اسلوب کے باب میں دو تاویلیں

ممکن ہیں۔ یا تو وہ تاویل اختیار کر لیجئے جو وقت کے متعلق اوپر گذر چکی ہے یا اجلت الآجال کے معنی میں لے لیجئے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہوگا

[وما ادراک] یعنی وہ دن عظیم الشان ہوگا۔ یہ اسلوب استفہام کبھی کبھی محض تفخیم کے لئے آتا ہے اور اس صورت میں جواب سے مستغنی ہوتا ہے۔ مثلاً الحاقۃ ما الحاقۃ وما ادراک ما الحاقۃ۔ کذبت ثمود وعاد بالقارعۃ

[ویل یومئذ للمکذبین] اس آیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہاں صرف مناسب مقام امور کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا واذا النجوم طمست الآیۃ کا جواب نہیں ہے۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

۱۔ اس کے جس قدر نظائر ہیں ان میں معنوی تعلق کے باوجود اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔

۲۔ اس طرح کی شرط کے موقع پر، جواب پر ف آتی ہے۔ الا انکہ جواب جملہ فعلیہ یا ظرفیہ ہو۔ مثلاً فاذا نقر فی الناقور فذلک یومئذ یوم عسیر۔ دوسری جگہ ہے۔ یوم تمور السماء مورا وتسیر الجبال سیرا فویل یومئذ للمکذبین۔

۳۔ اس قسم کی شرط میں جواب محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً اذا السماء انشقت و اذنت لربہا وحقت واذا الارض مدت والقت ما فیہا وتخلت۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ . يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ الآیۃ اس میں جواب محذوف ہے، اس لئے کہ سیاق کلام سے خود واضح ہے۔

۴- ہواؤں کی شہادت اور آیات کا نظم و موقع

ہم اپنے رسالہ "الامعان فی اقسام القرآن" میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ قسمیں مقسم علیہ پر دلیل و شہادت ہیں۔ پس یہاں بھی ان ہواؤں کا ذکر اسی مقصد سے ہوا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیان میں ان کے مختلف پہلو آشکارا کئے گئے ہیں، وہ چھوڑ دی جاتی ہیں، تیز و تند ہو جاتی ہیں، بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں، نباتات کو اگاتی ہیں حیوانات کی پرورش کا سامان کرتی ہیں، پھر ہر سرزمین کے ساتھ ان کا معاملہ یکساں نہیں ہوتا۔ اس میں فرق و اختلاف ہوتا ہے۔ کہیں پانی برساتی ہیں۔ تو کہیں خشک و بنجر چھوڑ جاتی ہیں، ایک قوم کو اپنی زرخیزیوں اور شادابیوں کی دولت سے مالامال کر دیتی ہیں۔ دوسری کو اپنے اولوں اور بگولوں اور کڑک اور دمک کی آفتوں سے تباہ کر دیتی ہیں۔

یہ سب حالتیں اور خصوصیتیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ واضح ہو کہ ان کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسکی قدرت و حکمت ان پر پورا تصرف رکھتی ہے۔

وہ اپنی عام حالت میں خدائی رحمت کیلئے پیام بشارت ہیں لیکن جب وہ چاہتا ہے۔ ان کے ذریعہ سے ایک ظالم قوم کو ہلاک و برباد کردیتا ہے اور دوسری مظلوم لیکن صالح قوم کو ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے۔ کبھی ان کی باگیں ڈھیلی کردیتا ہے اور کبھی کھینچ لیتا ہے، یہ تمام باتیں سورہ ذاریات کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ اور قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس قدر توضیح و تفصیل کے ساتھ ان کو دہرایا ہے کہ یہاں دلائل کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

انہی ظاہری احوال و آثار پر قرآن نے ایک عظیم الشان حقیقت کی بنیاد رکھدی ہے، یعنی دنیا میں ہواؤں کے جو تصرفات ہم دیکھتے ہیں، ان سے رحمت، عذاب، بخشش و انعام اور نفع و نقصان کے جو مظاہر ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں، ان ہی سے ایک روز جزا کے وقوع پر دلیل قایم کی ہے، کیونکہ قانون جزا و سزا کی اتنی نشانیاں اور دلیلیں ان کے اندر نمایاں ہیں کہ کوئی شخص انکا انکار نہیں کرسکتا۔ یہ خدا کی پروردگاری، اس کی قدرت، اسکی حکمت اور اسکی تدبیر کی گواہی دیتی ہیں، اور واضح کرتی ہیں کہ وہ اپنے بندوں سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے انعام کی بخششیں اور اس کے عذاب کے تازیانے آئے دن ان کے لئے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ پس جب یہ سب کچھ دنیا میں ہورہا ہے ہم اپنی آنکھوں

ہے یہ عجائب روزانہ دیکھ رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے ایک ایسا دن نہ آئے جس میں
ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے۔

یہ جزا و سزا کے وقوع پر بنیادی دلیل ہے اور پوری طرح کفایت کرتی
ہے۔ لیکن معاملہ کی ایک خاص حالت اس سے کچھ زیادہ کی مقتضی ہوئی۔ کفار
اپنی شدت غفلت کے باعث روز جزا کے دو وجہوں سے منکر تھے۔ ایک اس
کے عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے، دوسرے اس کی تاخیر کی وجہ سے۔ وہ کہتے
تھے کہ ہم بہت دنوں سے اس کی آمد کی دھمکیاں سن رہے ہیں لیکن وہ آتی نہیں۔
پس موقع مقتضی ہوا کہ کلام کا اسلوب ایسا ہو کہ ان دونوں شبہات کا آپ سے آپ
جواب نکل آئے۔

چنانچہ پہلے شبہہ کو یہاں یوں دور کیا کہ روز قیامت کی جو تفصیلات بیان
فرمائیں وہ تمام ایسی ہیں جو ہواؤں کے فعل سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً ہوائیں
نشانات کو مٹا دیتی ہیں، آثار کو دبا دیتی ہیں، بادلوں کو اڑا لیجاتی ہیں اور بسا اوقات
تیز ہو جاتی ہیں تو ان کے زور سے دیواریں ڈہ جاتی ہیں، چھتیں اڑ جاتی ہیں، عالیشان
عمارتیں پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ یہ ہمارے آئے دن کے مشاہدات
ہیں، لیکن ابھی ان کو دیکھنے کے لئے ہماری آنکھیں نہیں کھلی ہیں۔ قرآن مجید نے

ان کی طرف اسی مقصد سے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص ان کو سمجھ جائے گا وہ ایک ایسے دن کے ظہور کے متعلق شبہ میں نہیں رہ سکتا جس دن ستارے چھپ جائیں گے آسمان کھل جائیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کیونکہ ہواؤں کے عجائب تصرفات میں ان کی نشانیاں موجود ہیں اور پوری طرح واضح۔

دوسرا شبہہ ایک عام شبہہ تھا اسی لئے قرآن مجید نے اس کا مختلف مواقع پر مختلف پیرایہ میں جواب دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا	اگر اللہ مواخذہ کرتا لوگوں کی بداعمالیوں پر فوراً تو روئے زمین
مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ	پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو مہلت
وَلٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى فَإِذَا	دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک پس جب ان کی
جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ	مدت پوری ہو جائے گی تو بیشک اللہ اپنے
بَصِيرًا	بندوں کا نگران حال ہے۔

یہاں اس سے کسی قدر مختلف پہلو اختیار فرمایا ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ وہ روز جزا، یَوْمُ الْفَصْلِ، دو ٹوک فیصلہ کا دن ہو گا۔ پس رحمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو مہلت بخشے اور نصیحت و عبرت کے زیادہ سے زیادہ مواعظ ان کے کانوں تک پہنچا دے تاکہ جو غافل اور بے پروا ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے اور جن کے

دلوں میں نصیحتوں کے سننے اور قبول کرنے کی کچھ صلاحیت ہے وہ اپنے لئے نجات کی راہ ڈھونڈلیں کیونکہ جب وہ دو ٹوک فیصلہ کا دن آجائے گا تو مہلتوں کے دروازے بند ہو جائینگے پھر نہ تو غافلوں کے لئے توبہ کی فرصت باقی رہے گی اور نہ ان کا کوئی عذر مسموع ہوگا، اور نہ ان کے پاس کوئی تدبیر ہی ایسی ہوگی جس سے وہ خدا کے انتقام کی سخت پکڑ اور اس کی عدالت کاملہ کے فیصلہ سے اپنے کو بچا سکیں۔ چنانچہ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے پہلے اس یَوْمُ الْفَصْلِ کی عظمت واہمیت کو بیان فرمایا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی حماقت کو آشکارا کیا جو اس دن کی آمد کے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ایسے دن کے منکر ہیں جو اٹل ہے۔ اگرچہ اس کے ظہور میں دیر ہو۔ اس کے بعد پندرہ دیں آیت وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ہے۔ غور کرو کہ یَوْمُ الْفَصْلِ اور یَوْمُ الْجَزَاءِ کے ذکر کے بعد اس آیت کا آنا کس قدر باموقع اور بلیغ اسلوب کلام ہے! ان دو جامع لفظوں کے اندر وہ سب کچھ بیان ہو گیا جو اس دن منکروں کے سامنے آئے گا۔ اس کے بعد خرابی کے اسباب اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل کر دی جو آگے دیکھو گے۔ اب ہر تنبیہ کے بعد اسی جامع مفہوم میں سے کوئی مناسب مقام پہلو نمودار ہو جائے گا۔

یہاں تک فطرت کے عام احوال و معاملات سے استدلال تھا۔ اس کے بعد

کلام نے دوسری روش اختیار کرلی یعنی گذرے ہوئے واقعات، ثابت و قائم آثار اور آزمائی ہوئی سنت اللہ سے شہادت پیش کی ہے، اور یہ قرآن مجید کا ایک معروف انداز ہے۔ فرمایا۔

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ۝ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ	کیوں ہم نے مٹا نہ دیا اگلوں کو، پھر ان کے پیچھے
الْآخِرِينَ ۝ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۝	پچھلوں کو بھی، گنہگاروں کے ساتھ ہم یونہی کیا کرتے ہیں
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ أَلَمْ	اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ کیا ہم نے تمھیں
نَخْلُقكُّم مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝ فَجَعَلْنَاهُ	ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا، پھر اسے
فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝	ایک آرام کی جگہ میں رکھا، ایک مقرر زمانہ تک ہم نے
فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ۝	مقرر کیا، کیا خوب ہم مقرر کرتے ہیں۔ اس دن
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ أَلَمْ	منکروں کی خرابی ہے۔ کیا ہم نے زمین کو
نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝ أَحْيَاءً	سمیٹنے والی نہیں بنایا، زندہ اور مردہ کو۔ اور
وَأَمْوَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ	اس میں گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے
شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُم مَّاءً فُرَاتًا ۝	اور خوشگوار پانی پلایا۔ اس دن منکروں
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝	کی خرابی ہے۔

۵- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[مَهِین] مُهنۃ کے معنی ہیں عدم اہتمام کے۔ یہیں سے ابتذال اور تحقیر کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ امتھنت الشی کے معنی ہوئے، تم نے اس کو حقیر و متبذل خیال کیا۔ اسی سے ماھن ہے جس کے معنی نوکر اور غلام کے ہیں۔ مھنۃ کے معنی خدمت کے ہیں۔ مھنہ اس کی خدمت کی۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّهِینٍ۔ ہر لباٹے ذلیل کی بات نہ سنو۔ مَهِین یعنی بتذل۔ ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرعون کا قول نقل ہوا ہے۔ ام انا خیرمن ھذا الذی ھومھین ولا یکاد یبین۔

[قَرَارٍ] قرار کے معنی سکون اور جائے سکون دونوں کے آتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کو دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ وان الاٰخرۃ ھی دار القرار یعنی آخرت ہی سکون کا گھر ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے امن جعل الارض قرارا یہاں قرار کا لفظ موضع قرار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے یَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ اس میں داخل ہونگے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ یہیں سے قرار کا لفظ زمین کے گوشۂ ہموار و مطمئن کے لئے بھی

استعمال ہوا۔ مثلاً فرمایا وآوینٰھما الیٰ ربوۃ ذات قرار ومعین۔

[مَکِیْنٍ] مکین کے معنی ہیں مطمئن۔ کبھی یہ جگہ کی صفت کے لئے آتا ہے
اس وقت معنی ہوتے ہیں ایسی جگہ جو ہر طرح کے اضطراب و تزلزل سے بالکل مامون
ہو۔ اور کبھی یہ ذوی العقول کی تعریف کے لئے آتا ہے، اس وقت اس کے معنی یہ
ہوتے ہیں کہ ایسا شخص جو بھروسا اور اعتماد کے لائق اور مرتبہ کے لحاظ سے صاحب عزت
و رسوخ ہو، قرآن مجید میں ہے عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ
بادشاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا۔ اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ

[قَدَرٍ] قدر الشی چیز کی مقدار اور اس کا اندازہ۔ انا کل شیءٍ خلقناہ
بقدر ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک اندازہ کے ساتھ۔ دوسری جگہ ہے۔ وَاِنْ
مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ نہیں ہے کوئی
چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے موجود ہیں اور ہم اس کو نہیں اتارتے مگر ایک
متعین اندازہ کے ساتھ۔ سکون دال کے ساتھ بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔
قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔ دوسری جگہ ہے۔ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا

[معلوم] معلوم کے معنی ہیں معین شدہ اور پرکھ چکے ہیں۔ جو چیز
معین نہیں ہے، مبہم ہوگی، وہ معلوم نہیں ہو سکتی۔

[قَدَرْنَا] یہ قدر سے ہے بمعنی تقدیر کے یعنی اندازہ ٹھہرانا، شواہد اوپر گذر چکے ہیں۔ اور قدرت سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہ معنی بھی نہایت معروف ہیں۔ یہاں دونوں معنی لگ سکتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں اس کی ان دونوں صفتوں کی جلوہ گری ہے..... قرآن مجید میں ان دونوں کے نظائر بھی موجود ہیں۔

[کِفَاتاً] کفتہ ضمہ و جمعہ، جمع کر لیا۔ اکٹھا کر لیا۔ حدیث شریف میں ہے اکفتوا صبیانکم باللیل۔ رات میں اپنے بچوں کو اکٹھا کر لیا کرو۔ کفتہ عن وجہہ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے چہرہ سے ہٹا دیا۔ اسی سے کفت چھوٹی ہانڈی کے معنی میں ہے۔ عربی میں فعال کا وزن اس چیز کے لیے بھی آتا ہے جس کے ذریعے فعل انجام پذیر ہو۔ مثلاً زمام اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہو گئی ہے اور اس کے بعد مفعول کا استعمال جائز ہوا۔

[رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ] یعنی پہاڑ جن کی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی اور چوٹیاں فضا میں بلند ہیں۔ صفت نے موصوف کو خود واضح کر دیا اس وجہ سے موصوف کا ذکر نہیں ہوا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے۔ اور قرآن مجید میں اس کی بہت مثالیں مل سکتی ہیں۔

[فرات] وہ پانی جو نہایت شیریں ہو۔ قرآن مجید میں ہے وَهُوَ الَّذِی

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ۔ دوسری جگہ ہے۔
وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ۔
اسی وجہ سے کوفہ کی نہر کو فرات کہتے ہیں۔

اِن آیات کی تفسیر، ان کا نظم اور مدعا پر ان کی حجت

ان آیات میں تین فقرے اور تین ترجیعات ہیں۔ اور یہ تینوں ترجیعات تین مستقل خطابات کے بعد بار بار نمودار ہوئی ہیں۔ اور ہر خطاب استفہام اقراری سے شروع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام باتیں مخاطب کی جانی بوجھی ہوئی ہیں۔ پھر غور کرو یہ تینوں خطابات تین مختلف پہلوؤں سے معاد پر دلیل پیش کرتے ہیں پہلے خطاب میں، زمین کے آثار و نشانات سے استدلال ہے، دوسرے فقرے میں انسان کی خلقت اور رحم کے اندر اس کی پرورش اور صورت گری سے استشہاد ہے، اور تیسرے میں اس زمین کو رحم کی مثال قرار دیا گیا ہے۔ اور اس پہلو سے معاد پر اس سے دلیل پیش کی گئی ہے۔

یہ پہلا خطاب ان واقعات کو یاد دلاتا ہے جن کے آثار مخاطب کے گرد و پیش موجود ہیں۔ یعنی نافرمان قوموں کی ہلاکت و بربادی کے واقعات۔ اہل عرب خوب

واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں۔ مثلاً عاد و قوم لوط کو ہوا کا عذاب بھیجکر ہلاک کر دیا۔ یہاں چونکہ ہوا کے تصرفات کی شہادت موجود تھی اور مقصود آس پاس کی بستیوں سے عبرت دلانا تھا اس لئے معاملہ بغیر تفصیل کے واضح تھا چنانچہ واقعات کا ذکر نہیں فرمایا۔ صرف اجمال کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ..... كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ۔ لیکن دوسرے مقامات میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ......

پس جب انھوں نے اسکو دیکھا ابر کی شکل میں بڑھتا ہوا اپنی وادیوں کی طرف، کہا یہ تو ابر ہے جو ہم پر برس کے رہیگا۔ نہیں بلکہ وہ وہ چیز ہے جس کیلئے تم جلدی مچا رہے تھے۔ تند ہوا جسمیں درد ناک عذاب ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تہس نہس کر دیگی۔ پس وہ اس طرح ہلاک ہو گئے کہ انکے گھروں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ ایسی ہی بدلہ دیتے ہیں ہم گنہگاروں کو۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ

اور ہم نے تمہارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں اور اپنی آیتیں پھیر پھیر کر بیان کیں کہ وہ رجوع کریں۔

اب اس روشنی میں اگر اس خطاب کو سمجھا جائے تو اس کے معنی بالکل واضح ہوجائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے اگلے مجرموں اور شریروں کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ ہماری ایک جاری و قائم وسنت ہے۔ یکے بعد دیگرے قوموں کی بربادی کے واقعات تم جانتے اور سنتے رہے ہو، پس آخرت کا معاملہ بھی یونہی ہے۔ جو گنہگار ہونگے سزا پائیں گے، جو نیکوکار ہوں گے وہ ہماری خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔ یہ تفصیل ایک 'یَوْمُ الْفَصْلِ' کے وقوع تک خود بخود منتہی ہو رہی تھی، اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی، البتہ اس سے جو لازمی نتیجہ پیدا ہو رہا تھا اس کا ذکر کر دیا وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ تاکہ منکروں کو اس دن جن حالات سے دوچار ہونا ہے اس سے خبردار ہوجائیں۔ یہاں ویل کے ایک لفظ نے عذاب کی تمام اقسام کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ نیز آیت کے موقع سے یہ بات خود بخود نمایاں ہے کہ فیصلہ کے دن کا انکار ایک سخت ترین جرم ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالےٰ کے عدل اور اس کی قدرت و رحمت کا انکار ہے، پھر یہ ہر طرح کے شرک و معصیت کا سرچشمہ اور اللہ تعالیٰ کی آیات، اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے متکبرانہ اعراض ہے۔ یہاں یہ باتیں اشارات سے معلوم ہو رہی ہیں۔ دوسرے مقامات میں ان کی پوری تفصیل آگئی ہے۔

دوسرے خطاب نے نظم کے ایک خوبصورت پہلو کو نمایاں کیا ہے یعنی پہلے میں آفاق کی شہادت پیش کی گئی تھی اور اس میں انفس کی شہادت پیش کی گئی ہے اور ان دونوں کا اجتماع قرآن مجید کی بعض آیات میں بالکل نمایاں ہے۔ مثلاً

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ
اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنیوالوں کیلئے اور تمہارے نفوس کے اندر بھی پس کیا تمکو نظر نہیں آتیں

اس خطاب میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار نے تمہاری خلقت کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا اہتمام فرمایا، کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری زندگی کے کلی امور سے جو بالکل بنیادی اور نہایت اہم ہیں بے پروا ہو جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ پہلی بار تمہاری خلقت اور مصوری پر قادر ہوا اور کوئی چیز اس کو عاجز نہ کر سکی تو تم کو دوبارہ اٹھانا تو اس کے لئے اور آسان ہے۔

وَیَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا ۝ اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْـًٔا
اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤنگا، زندہ کرکے نکالا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے اس کو پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ نہ تھا۔

ان دونوں پہلوؤں سے یہ نکتہ ایک روز فیصلہ کے وقوع کو خود بخود واضح

کررہا تھا اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ فرمایا وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ یہ واضح کرنے کیلئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی اس تقدیر اور قدرت کے منکر ہوں گے ان کے لئے خرابی ہے۔ جب وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ چیز سامنے کھڑی ہے جس کا دنیا میں انکار کر رہے تھے تو ان کی تباہی ان پر پوری طرح آشکارا ہو جائے گی۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ	وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی تو دفعتہً وہ تاکنے
يَنۡظُرُوۡنَ وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا هٰذَا	لگیں گے اور کہیں گے ہائے بدبختی! یہ تو جزا کا
يَوۡمُ الدِّيۡنِ هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ	دن ہے، یہ فیصلہ کا وہی دن ہے جس کا تم
الَّذِيۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ	انکار کرتے تھے۔

تیسرے خطاب پر غور کرنے کے بعد جمع مثل بالمثل کی ایک عمدہ مثال ہمارے سامنے آتی ہے یعنی جس طرح زمین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ معاد کی دلیلوں اور نشانیوں سے معمور ہے، جیسا کہ اوپر ہم نے عاد وغیرہ کے قصہ کا حوالہ دیا ہے، اور قرآن مجید نے بار بار اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی طرح زمین کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ رحم سے بہت مشابہ ہے، بلکہ دونوں کی مشترک خصوصیات پر غور کرنے کے بعد بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جملہ خصوصیات کے اعتبار سے زمین کا

پہلو نمایاں طور پر مرجح ہے۔ اور قرآن مجید نے زمین کی صفت میں کفاتا احیاء و امواتا (سمیٹنے والی زندہ اور مردہ کو) کہکر درحقیقت اس کی اسی ترجیح کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ کر اس کو آرام و سکون کی جگہ بنایا۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ — اور بنائے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ کہ تمھیں لیکر ڈھلک نہ جائے۔

پھر ان پہاڑوں کو اونچا بنایا اور ان کے ذریعے بادلوں کو روک کر زمین میں بقدر ضرورت پانی کا خزانہ جمع کر دیا۔ پھر اس سے سوتیں اور نہریں جاری کیں۔ ان تمام امور کی طرف قرآن نے جابجا اشارات کیے ہیں۔

غرض پہاڑوں کے ذریعے زمین کو پابرجا اور مطمئن کرکے اور ان کی چوٹیوں، گھاٹیوں اور چشموں سے شیریں پانی کی سوتیں جاری کرکے، اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اس کو ویسا ہی پر امن گہوارہ بنادیا ہے، جیسا کہ رحم مادر جس میں جسم کے تمام گوشوں سے اس کے لیے غذا کا ذخیرہ نچڑ نچڑ کر جمع ہوتا ہے اور جس کی تعریف میں فرمایا ہے۔ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ بلکہ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان تمام خصوصیات میں تمنی کا پہلو نمایاں طور پر مرجح ہے۔ یہ تمام باتیں جس جامعیت و کمال کے ساتھ زمین میں

پائی جاتی ہیں، اس جامعیت و کمال کے ساتھ رحم میں نہیں پائی جاتیں۔ زمین تمام مخلوقات کے لیے بمنزلۂ رحم ہے۔ پھر جب انسان مرتا ہے اور اس میں دفن کیا جاتا ہے تو گویا وہ اس ماں کے رحم میں رکھدیا جاتا ہے جس نے اسے جنا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس حقیقت کی طرف کس قدر لطیف اشارہ کر رہی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ — اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائینگے
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى — اور پھر اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

ظاہر ہے دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔ پھر انسان اس کی کیوں تکذیب کرے۔ اگر وہ زمین کے معاملات اور اس کے اندر اپنی زندگی اور موت کی اصلی نوعیت پر غور کرے تو وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس پر ایک نئی حقیقت روشن ہوگی جو اس کے ایمان و یقین کو اور زیادہ محکم کردے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن وہ پیدا ہوا تو گویا پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا حمل قرار پایا اور جس دن مرا تو گویا مرا نہیں بلکہ پیدا ہوا۔ پھر دوسرے پہلو سے غور کرے گا تو ایک اور حقیقت اس کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس وقت وہ مرا تو گویا مرا نہیں بلکہ زمین کے پیٹ میں اس کا حمل قرار پایا اب ناگزیر ہے کہ اس حمل کے لئے بھی ایک دن وضع حمل کا آئے اور وہ دن وہی ہوگا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا	جب زمین میں بھونچال ڈالا جائے اور زمین
وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا	اپنے بوجھ باہر ڈال دے۔

اس تفصیل پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ اس کلام کا مقصد ربوبیت اور احاطہ کے پہلو سے معاد پر استدلال ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ ہمارا پروردگار ہے اور ہم زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اس کی مٹھی میں ہیں تو ناگزیر ہے کہ ایک دن بازپرس کا بھی آئے جس میں ہم اپنے اعمال کے متعلق جواب دہ ہوں۔ اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک روز فیصلہ کے ثبوت تک خود بخود پہنچ گیا۔ اور اسکی ضرورت باقی نہیں رہی کہ لفظوں میں اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر سے گذر کر فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (اس دن خرابی ہے انکار کرنے والوں کے لئے) یعنی جنھوں نے آج خدا کی پروردگاری اور اس کے احاطہ قدرت کا انکار کیا ہے، جب وہ اپنے پروردگار کے حضور جمع کئے جائیں گے تو ان کے سامنے ان کے انکار کی بدبختی پوری طرح آشکارا ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ	اور صور پھونکا جائے گا تو دفعۃً وہ قبروں سے
الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ	نکلکر اپنے پروردگار کی طرف چل کھڑے ہوں گے

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا
هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ
الْمُرْسَلُوْنَ

اور کہیں گے ہائے ہماری خرابی! ہم کو کس نے ہماری
خواب گاہ سے اٹھایا۔ یہی وہ چیز ہے جس کا رحمٰن
نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

اس کے بعد بلاغت کا ایک نیا اسلوب نمودار ہوا ہے۔ یعنی جو چیز اب تک نگاہوں سے اوجھل تھی وہ سامنے حاضر کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کلام کا اسلوب ایسا اختیار کر لیا گیا ہے جو ایک حاضر و مشہود چیز کے مناسب حال ہوتا ہے۔ گویا وہ فیصلہ کا دن آگیا ہے۔ لوگ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہیں۔ اور جس چیز کا آج تک انکار کرتے رہے تھے وہ سامنے موجود ہے۔ فرمایا۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ
اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۳۰
لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۳۱
اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۳۲ كَاَنَّهٗ
جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۳۳ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۳۴ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۳۵
وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۳۶

جس کے تم منکر تھے اس کی طرف چلو۔ تین طرف
پھوٹنے والے سایہ میں چلو جس میں نہ چھاؤں
ہے نہ لپک سے بچاؤ۔ گندوں کے برابر اس
میں سے چنگاریاں اڑتی ہیں، زرد اونٹوں کے
مانند۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ یہ
وہ دن ہوگا کہ ان سے بات نہ نکلے گی اور
نہ اجازت ہوگی کہ معذرت کریں۔ اس دن

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ○ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ○ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○

منکروں کی خرابی ہے۔ یہ فیصلہ کا دن ہے ہم نے تمہیں اور اگلوں کو جمع کیا۔ پھر اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو ہم سے چلو۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۲۹-۴۰)

[ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ] اس سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ آگ کے کسی بڑے الاؤ سے جب دھواں اٹھتا ہے، اس سے مختلف شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور وہ بالکل سائبان کی طرح چھا لیتا ہے۔ اس کی تاویل آگے بیان ہوگی۔

[لَا ظَلِيْلٍ الاٰیۃ] یعنی سایہ کی ٹھنڈک سے بالکل خالی ہوگا۔ وَلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ کہکر اس کی مزید توضیح کردی۔ ایک جگہ فرمایا ہے وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر لفظ ظل (سایہ) سے جو وہم پیدا ہو رہا تھا اس نفی نے اس کا ازالہ کردیا۔

[اِنَّهَا] یعنی وہ شعلے جو اس سایہ کے پیچھے ہیں۔

[کَالْقَصْرِ] مشہور قرأت سکون صاد کے ساتھ ہے پس وہ قول ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے کہ اس سے اونٹوں کی گردنیں مراد ہیں اور یہ قصرۃ کی جمع بمعنی اصل العنق ہے۔ اولاً تو بعد کا قافیہ (فاصلہ) اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ثانیاً قصرۃ گردن کی جڑ کو کہتے ہیں یعنی یہ انسانی جسم میں ایک مخصوص جگہ کا نام ہے، کسی مستقل عضو کا نام نہیں ہے کہ اس سے شعلوں کو تشبیہ دی جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قصرۃ کی جمع ہے۔ قصرۃ بڑے درخت کی جڑ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔ بعد کی تشبیہ اس سے مطابق نہیں ہوتی۔ پھر یہ دونوں لفظ قرآن کی زبان سے نامانوس ہیں۔ اور کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں جو ان کی توضیح کردے۔ رہا لفظ قصر تو وہ قرآن میں بار بار آیا ہے۔ پس ظاہر تاویل ہی ہمارے نزدیک قابل قبول ہے اور یہی ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور رنگ میں ہے کیونکہ محل عموماً بلند جگہوں پر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ اور دور سے ان کو دیکھو تو ان کا رنگ چمکتا نظر آئے گا اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف معلوم ہوگا، یہاں تشبیہ میں محلوں کی بڑائی کا پہلو مد نظر نہیں ہے بلکہ صرف ان کی وہ ہیئت پیش نظر ہے

جو دور سے نظر آتی ہے۔ اہل عرب نے اس لفظ کو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں صورتوں میں استعمال کیا ہے اور پیش نظر وہی پہلو ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

عمرو بن کلثوم کہتا ہے۔

واعرضت الیمامۃ واشمخرت کاسیاف بایدی مصلتینا

اور یمامہ کی بستیاں سامنے سے ایسی ابھری نظر آتی ہیں جیسے تلواریں سونتنے والوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں

اس وجہ سے اونٹنی کو محل اور پل سے اکثر تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ عربی زبان میں اس قدر عام بات ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد جمالۃ صفر سے جو تشبیہ دی ہے اس سے دعوی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

[کانہ جمالۃ صفر] ضمیر کا مرجع شرر ہے۔ اور یہاں رعایت لفظ کی گئی ہے۔ شرر اسم صنف ہے اس لئے مذکر، مؤنث، واحد، جمع سب کے لیے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور "جمالۃ صفر" سے تشبیہ اس کا ثبوت ہے۔ جمالۃ زرد اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو ایک ہی ساتھ نمایاں کر رہی ہے، صفر (زردی) کی قید اس لئے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔

ظل ذی ثلث شعب سے ایک لطیف نکتہ

[ظِلٍّ ذِی ثَلٰثِ شُعَبٍ (تین طرف پھوٹنے والا سایہ)] جہنم کو اس طرح مصور کر کے پیش کر رہا ہے گویا وہ کسی جاندار چیز کی طرح لپکتی ہوئی چلی آرہی ہے اور اس کا دھواں تین مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی جہنم کی تصویر کچھ اسی سے ملتی جلتی پیش کی گئی ہے۔ مثلاً

وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ	اور جنھوں نے قیامت کا انکار کیا ہم نے ان
سَعِيْرًا اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ	کیلئے دوزخ تیار رکھی ہے جب انکو دور ہی سے
سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا	دیکھے گی، وہ اس کا زور شور سنیں گے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر سورہ ق میں ہے۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ	جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کیا تو بھر گئی
وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ	اور وہ کہے گی کہ کیا اور ہے۔؟

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى	بیشک وہ لپٹ ہے اور ادھیڑ دے گی پنڈلی کا گوشت
تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى	اور جنھوں نے اعراض کیا اور سرگردانی کی ان کو

یہاں ثلث شعب سے ظاہر مقصد صرف آگ کے ہیجان واشتعال کو بتلانا ہے لیکن اگر اس پر غور کیجیے تو فکرو نظر کے لیے بھی اس میں کافی وسعت ہے۔

یہ معلوم ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت، (۲) مخلوق سے بے پروائی (۳) روز جزا کا انکار۔ ان امور کی تفصیل اپنے موقع سے گذر چکی ہے۔ یہاں زیادہ وسعت کے ساتھ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بعض شواہد کا حوالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک جگہ اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ ان لفظوں میں مذکور ہوا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ. قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ. وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ. وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ. وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ۔	کون چیز تم کو دوزخ میں لائی کہیں گے ہم نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، جو لوگ بیہودہ بکواس کیا کرتے تھے ان کے ساتھ ہم بھی بکواس کیا کرتے تھے اور جزا کے دن کا انکار کرتے تھے۔

اس آیت میں خوض سے مراد انکار قرآن ہے اور اس انکار کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قرآن روز جزا کی خبر دیتا ہے جس کو تسلیم کرنے کیلئے وہ ہرگز آمادہ نہ تھے۔ دوسری جگہ فرمایا

اَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ	سو جس نے سخاوت کی اور ڈر کر چلا اور اچھی بات کو

بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى — سچ مانا اس کو ہم سہج کر دینگے آرام دینے والی کو
وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ — جس نے بخالت اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو
بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى — جھٹلایا اس پر سہج کر دینگے مشکل میں ڈالنے والی

ان دونوں آیتوں کے مطالب پر پوری وسعت کے ساتھ غور کرو، ان سے کفار کی یہ تینوں بنیادی خصلتیں پوری طرح نمایاں ہوجائیں گی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہی تین خصلتوں کے مطابق جہنم سے عذاب کی تین شاخیں نمودار ہوکر ان کی طرف بڑھیں گی، اور ان کو چھالیں گی۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ۔

اسی سے لگتی ہوئی تاویل حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے۔

ابو عبد اللہ جدلی راوی ہیں کہ "میں بیت المقدس میں آیا، دیکھا کہ عبادہ بن صامت، عبد اللہ بن عمر اور کعب احبار بیت المقدس میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ عبادہ نے کہا جب قیامت کا دن آئے گا، اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرے گا یہاں تک کہ ایک ہی جگہ سے ان کو نگاہ دیکھ سکے گی اور داعی اپنی آواز سنا سکے گا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا، آج کے دن ان کے منہ سے بات نہ نکلے گی یہ فیصلہ کا دن ہے، ہم نے تم کو اور تمھارے اگلوں کو جمع کیا ہے۔ پس اگر آج تمھارے پاس

کوئی داؤ ہو تو وہ ہمارے ساتھ کر دیکھو، آج کوئی متمرد اور سرکش شیطان عنید نجات نہ پاسکے گا؛ اس کے بعد عبداللہ بن عمر نے کہا کہ کتاب میں ہم پاتے ہیں کہ قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نمودار ہوگی اور جب وہ لوگوں کے سامنے آئے گی تو کہے گی اے لوگو! میں تین قسم کے لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہوں جن کو میں اس سے زیادہ پہچانتی ہوں جتنا باپ اپنے بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو پہچانتا ہے، آج انکو نہ کوئی چیز بچا سکتی ہے اور نہ کوئی چھپا سکتی۔ خدا کا شریک ٹھہرانے والے، جبار و سرکش اور متمرد شیطان فرمایا۔ پھر ان کو لپیٹ لے گی اور جہنم میں حساب سے چالیس سال پہلے ڈالدیگی (اخرجہ ابن حاتم)

مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں عبداللہ بن عمرؓ نے جن تین جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ آیت ذیل سے اخذ کر کے فرمایا ہے۔

اَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ	ڈالدو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش، بھلائی سے
مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُرِيبٍ الَّذِي	روکنے والے، حد سے بڑھنے والے، شک میں
جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ	پڑنے والے کو جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا
فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ	معبود ٹھہرایا ہیں اسکو ڈالدو سخت عذاب میں۔

اچھا اگر اس پر تامل کرو تو وہی تین صفتیں تمھارے سامنے آئیں گی۔

جو اوپر ہم نے بیان کی ہیں یعنی خلق خدا سے بے پروائی، آخرت کا انکار، خدا سے غفلت، کیونکہ شرک خدا سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔

ان آیات کے نظم اور مواقع ترجیع پر ایک مجموعی نظر

اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ یہاں خطاب کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا ہے کہ جس سے پردہ کی چیز بالکل نگاہوں کے سامنے آگئی ہے اور ظاہر ہے کہ تاثیر کے اعتبار سے یہ اسلوب نہایت اعلیٰ ہے اور چونکہ یہ تاثیر کمال درجہ پر پیدا کرنی تھی اس لئے قیامت کی تصویر ایسی کھینچی جو مخاطب کے حواس پر پوری طرح چھا جائے۔ پھر اسی مناسبت سے ویل کا ذکر فرمایا اور یہاں آیت ویل کے محل نے خود اس مضمون کو پوری طرح واضح کر دیا جو یہاں پیش نظر ہے۔ یعنی یہ عذاب، جو اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ان کے لئے بالکل تیار ہے، ان کے لئے نہایت خوفناک خرابیوں کا سبب ہوگا۔

شدت عذاب کے محسوس پہلو کی تصویر کے بعد اس کے اس پہلو کو بے نقاب کیا جس کا احساس ذہن کریگا یعنی معذرت کی فرصت سے محرومی، اور یہ عذاب کی ظاہری ہولناکیوں کے بعد اس کا ایک باطنی تازیانہ ہوگا جو براہ راست

دلوں پر لگے گا۔ چنانچہ اس کے بعد آیت ویل کو پھر دہرایا اور موقع کے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہاں اس سے مختلف ہے جو اوپر بیان ہوا یہاں یہ مفہوم ہے کہ اس دن ان کے لئے خرابی اور حسرت و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا عذر و معذرت کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

ان ترہیبات کے بعد ان کو پھر ایک نئے انداز سے خطاب فرمایا، اس خطاب میں جھڑکی اور اسکات و تذلیل کا پہلو نمایاں ہے۔ اور دنیا میں معاد کا جو وہ انکار کرتے رہے ہیں اس کا باندازِ تحقیر جواب ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا	یہی وہ جہنم ہے جس کا تم انکار کرتے تھے۔
تُكَذِّبُوْنَ اَفَسِحْرٌ هٰذَا اَمْ اَنْتُمْ	یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھائی نہیں دیتا۔
لَا تُبْصِرُوْنَ	

. . . .

اس خطاب میں اپنی قدرت کی بے پناہ وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہم نے تمام اگلوں اور پچھلوں کو جمع کر لیا ہے۔ کوئی نہیں جو آج کے دن ہماری پکڑ سے بچ رہا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک خطاب نمودار ہوتا ہے، جو غائب کو مخاطب کے سامنے مشہود کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی

ہے کہ اس دن تمام تدبیریں اکارت ہو جائیں گی۔ کوئی داؤ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح اوپر یہ بیان فرمایا تھا کہ اس دن عذر و معذرت کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی۔ اسی طرح یہاں بیان فرمایا کہ اس دن نہ کوئی چال اور تدبیر کام آئے گی نہ کوئی طاقت و قوت کچھ نفع پہنچائے گی۔ اس میں گویا ایک مخفی تعریض ہو گی کہ دنیا میں ان کو اپنی تدبیروں اور قوتوں پر بڑا غرہ تھا، پھر آج ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس مضمون کے بعد آیت ویل پھر نمودار ہو گئی اور یہاں موقع کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس دن ان کا کوئی داؤ کام نہ آئے گا، تمام تدبیریں دھری رہ جائیں گی۔ صرف تباہی اور ذلت و رسوائی نصیب ہو گی۔ یہ چالیس آیتیں تمام ڈراوے کی ہیں، ان کے بعد جمع ترغیب و ترہیب کے اس عام اصول کے مطابق جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، بشارت کی آیتیں آئیں تاکہ سختی اور نرمی کی ایک معتدل حالت پیدا ہو۔ پس فرمایا۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۴۲ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝۴۴	بے شک پرہیزگاروں کو سایہ ہوں گے اور نہریں۔ اور جیسا جی چاہے میوے۔ مزے سے کھاؤ پیو اپنے اعمال کے بدلے، بھلائی کرنے والوں کو ہم یونہی دیا کرتے ہیں۔ اس دن منکروں

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۵ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝۴۶ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۷ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝۴۸ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۹ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝

کی خرابی ہے۔ چند روز کھالو اور مزے کر لو تم تو ٹھہرے گنہگار۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ اور جب جھکنے کو ان سے کہا جائے تو نہیں جھکتے۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ اب اس کے بعد کس بات پر یہ ایمان لائیں گے۔

الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

[فِیْ ظِلٰلٍ] یعنی سایوں کے درمیان۔ قرآن مجید میں یہ مضمون اور یہ اسلوب بہت آیا ہے مثلاً اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ مَا اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (الواقعہ) اس سے ان نعمتوں کا بیان ہے جن سے وہ گھرے ہوں گے۔ یہی اسلوب برج بن مسہر الطائی نے استعمال کیا ہے۔

فبتنا بین ذالک وبین مسك فیا عجبا العیش لو یبد وم

پس ہم نے اس میں اور مشک کی خوشبوؤں میں شب بسر کی کیا مزے کی زندگی تھی کاش ہمیشہ رہتی

[هَنِيئًا] فعل مقدم سے جو مفعول مفہوم ہو رہا ہے اس سے حال
چھپا ہوا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا جس میں ذوالحال واضح
ہے۔ ذوالحال مقدر ہے۔ حال پر [illegible] عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔
[illegible] کہیں گے [illegible] ا۔

[وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ] اذا کا عام استعمال مستقبل کے لیے ہے۔ قرآن مجید
میں دوسری جگہ یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ کہ جب حشر میں
سب لوگ اکٹھے کیے جا چکیں گے تو پروردگار کے حضور سجدے کیلئے بلائے
جائیں گے تو جن لوگوں نے دنیا میں سجدہ نہ کیا ہوگا، وہ اس دن سجدہ نہ کر سکیں گے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ	جس دن کہ ہلچل پڑے گی اور وہ بلائے جائیں
إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ	کے سجدے کیلئے پس سجدہ نہ کر سکیں گے اور
خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ	ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت چھائی ہوگی
ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى	اور وہ سجدے کیلئے بلائے جاتے تھے اور
السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ	اس وقت بالکل صحیح وسالم تھے۔

پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ وہ فیصلہ کے دن سجدہ نہ کر سکیں گے۔
حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ دوسری تاویل یہ ہو سکتی

ہے کہ اذا عادت کو بیان کرنے کیلئے آتا ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے تاویل یہ
ہوگی کہ وہ دنیا میں نہیں جھکتے۔ اس کے بعد ہے "وَیْلٌ یَوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ"
سیاق سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ وہ دنیا میں نہیں جھکتے تو آخرت میں بھی
نہ جھک سکیں گے۔ اور یہ امر ان کے لئے باعث خرابی ہوگا۔

یہ محض الفاظ کا فرق ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں تاویلوں کا
مآل ایک ہی ہے۔

[بعدہ] یعنی اس بات کے بعد جو بہترین دلائل اور واضح ترین براہین
کے ساتھ ان کو معاد اور خدا پرستی کی تلقین کر رہی ہے، دوسری جگہ فرمایا ہے فَبِاَیِّ
حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیَاتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ۔ پس اللہ اور اس کی آیات سے
بڑھکر کیا بات ہے جس پر ایمان لائیں گے۔ پس بعدہ کا مفہوم وہی ہے جو فبای
حدیث سے مترشح ہو رہا ہے یعنی اگر اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب
کونسی بات اس سے زیادہ واضح اور دلوں میں گھر کرنے والی ہوگی کہ اس پر ایمان
لائیں گے۔

بعض لوگوں نے بعدہ سے یہ مفہوم سمجھا ہے کہ اس دن کے بعد
لیکن ہمارے نزدیک یہ احتمال ضعیف ہے۔ اس دن تو بہر حال ایمان لائیں گے۔

یہ بات عقلاً بھی واضح ہے اور قرآن بھی اس کا شاہد ہے۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ لَیْسَ لِوَقْعَتِہَا کَاذِبَۃٌ۔ اگر مقصود یہ ہوتا تو یہ فرمایا جاتا۔ فلاھی نفع بعدہ یومنون (اس دن کے بعد کس فائدہ کے لئے ایمان لائیں گے۔) ممکن ہے اس مفہوم کی تائید میں آیت ذیل سے دلیل لائی جائے۔

وَاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُہُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ

اور شاید کہ ان کی اجل قریب ہو تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔ . . . .

اس کے بعد یعنی اجل کے آجانے کے بعد۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل واضح نہیں ہے۔ اولاً تو یہاں 'اجل' کا لفظ صریحاً مذکور اور پاس ہی موجود ہے جس کی طرف ضمیر کو بے تکلف لوٹایا جاسکتا ہے۔ ثانیاً یہاں بھی کچھ ضروری نہیں کہ یہ مطلب لیا جائے۔ سیاق کلام نہایت واضح طور پر ایک دوسری حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ اوپر کی آیت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو ملامت کی جارہی ہے جو کتاب اللہ اور انبیاء ورسل کے منکر ہیں۔ پس اس مضمون کے اعتبار سے وہی تاویل موزوں ہوگی جو ہم نے اختیار کی سلف کا مذہب بھی یہی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمدؐ کی تحذیر کے بعد اب وہ کونسی تحذیر و تخویف ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے اگر اس کتاب کی تصدیق سے ان کو انکار ہے تو اب کونسی کتاب ہے جس کی وہ تصدیق کریں گے۔"

بعض دوسرے مفسرین کا بھی یہی مذہب ہے پس اس آیت سے جو شہوت پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔

آیات کی تاویل اور ان کا نظم

[کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا] میں غائب کو مشہود و مصور کرنے کا وہی اسلوب ملحوظ ہے جو اِنۡطَلِقُوۡا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ میں دو تاویلوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس کو پچھلے خطاب سے بالکل متصل مانا جائے اور ان آیات کے سیاق و مفہوم میں لیا جائے جو اکثر آخرت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد وارد ہیں، مثلاً فرمایا۔

اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمۡ جَزَآءً وَّکَانَ سَعۡیُکُمۡ مَّشۡکُوۡرًا

یہ تمہارے لئے بدلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔

دوسری جگہ ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا — اور یہ جنت ہے جس کے تم وارث ہوئے

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ — ہو اپنے عمل کے بدلے میں۔

دوسری یہ کہ اس کو التفات اور خطاب کے مفہوم میں لیا جائے اور اس کے نظائر بھی قرآن مجید میں بہت ہیں اور نظائر ہی پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔

آیت ویل یہاں بطور مقابلہ ہے یعنی جبکہ نیکوکاروں کو ان کے اعمال کے صلہ میں نعمتیں مرحمت ہوں گی۔ ان منکروں کے لئے عذاب ہوگا۔ اور یہ عذاب ان کے لئے دوہرا ہو جائے گا۔ ایک طرف تو عذاب کی اذیت ہوگی۔ دوسری طرف مومنین کی کامیابی پر حسرت واندوہ اور یہ غم بالائے غم ہے۔

[كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُجْرِمُونَ] اس آیت میں کافروں سے خطاب ہے اور اس میں بلاغت کے بہت سے اسالیب اکٹھے ہو گئے ہیں۔

(۱) اوپر مومنین کی نعمتوں کا ذکر تھا۔ پس اس آیت میں گویا اسکی متقابل حالت کا بیان ہوا۔

(۲) اسی میں جلد عذاب آنے کی دھمکی ہے۔

(۳) دنیا کی اس حقیر پونجی پر ان کو جو گھمنڈ ہے اس پر ملامت ہے۔ گویا ان کے لئے عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ صرف تھوڑی سی مہلت دیدی گئی ہے۔

جو کھانا پینا چاہتے ہیں کھا پی لیں بالآخر یہ حلق کی پھانس ہوگا۔

(۴) اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ روزِ جزا پر دلیل ہے یعنی چند روز کھا پی لو تمھارا مجرم ہونا طے پا چکا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ایک دن باز پرس اور بدلہ کا آئے۔ ایک جگہ اس مضمون کی وضاحت ہوگئی ہے۔ قل تمتعوا فان مصیرکم الی النار۔ کہہ دو، چند روز مزے کر لو، کیونکہ تمھارا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس کے بعد آیت ویل آئی ہے، جس سے مقصود ویل کی شدت اور قطعیت کا بیان ہے۔

[وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْکَعُوْا لَا یَرْکَعُوْنَ] یہ اپنی دونوں تاویلوں کے اعتبار سے اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ کا بیان ہے۔ کیونکہ جو دنیا میں اپنے پروردگار کے حضور نہ جھکا وہ حقیقت میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ اولین فریضہ خدا کے سامنے پستی و فروتنی کا اظہار ہے اور سب سے بڑی معصیت خدا سے استکبار۔ اور یہ تکذیب و انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى وَلٰكِنْ	پس نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی بلکہ انکار
كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى	کیا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں کی
اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى . اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى	طرف چل دیا۔ تیرے لئے ہلاکی ہے۔ پھر ہلاکی

ثُمَّ اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی ۔   ہے اور پھر ہلا کی ہے اور پھر ہلا کی ہے۔

دوسری تاویل کے اعتبار سے مضمون یوں ہوگا کہ پہلے فرمایا کہ تم آج مجرم ہو، اس کے بعد فرمایا کہ ان کا جرم قیامت کے دن کھلے گا۔ جب وہ جھکنے کیلئے بلائے جائیں گے، لیکن جھک نہ سکیں گے۔ اس کے بعد آیت ویل کا مفاد یہ ہوگا کہ یہ ویل ان کے عدم رکوع کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ مضمون آیت کی دونوں تاویلوں کے لحاظ سے بن جائے گا۔

"فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ" یہ خاتمہ کی ایک جامع آیت ہے، جس نے ان تمام مضامین کی طرف انگلی اٹھادی ہے جو از قبیل دلائل واز قسم ترغیب وترہیب اوپر بیان ہوئے تھے۔ اور اسلوب استفہام میں یہاں متعدد نکتے مضمر ہیں۔

(۱) اس سے اس کلام کی عظمت ومنزلت اور تبلیغی اعتبار سے اس کی جامعیت واضح ہوجاتی ہے۔

(۲) ان کے ایمان کی طرف سے ناامیدی ترشح ہوتی ہے۔

(۳) ان کے انکار پر تشنیع ہے۔

پھر آیت کے موقع سے یہ بات نمایاں ہے کہ اتمام حجت کے بعد

یہ تودیع کا آخری جملہ ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت
ہیں۔ مثلاً آخر سورہ طارق میں فرمایا۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ — شاہد ہے آسمان پرنگار اور زمین پرشگاف
ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ — کہ یہ دوٹوک بات ہے اور مسخری ہنسی نہیں
وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ — وہ چل رہے ہیں ایک چال اور میں چل رہا
كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ — ہوں ایک اور چال سو چھوڑ دے کافروں
الْكَافِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا — کو ذرا دیر کو۔

سورہ زخرف کے اخیر میں ہے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ — پس ان سے درگذر کرو اور کہو سلام
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ — وہ جلد جان لیں گے۔

اسی اسلوب کے مطابق خاتمہ کی آیت سے یہاں بھی واضح ہے
کہ جب اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب وہ کس چیز پر ایمان لائینگے
پس ان کو چھوڑ دو۔ تھوڑے دن کھا پی لیں اور مزے اڑا لیں۔
مُکَذِّبِیْنَ سے متعلق ہم نے اوپر تاویل کے جو پہلو بیان کئے تھے،
خاتمہ کی آیت نے اس دوسرے پہلو کو واضح کر دیا کہ یہی منکر ہیں جو اللہ

سے کلام کا انکار کرتے ہیں پس معلوم ہوا کہ اصل قرآن کا انکار نتیجہ ہے ان کے انکار قیامت اور نماز اور بندگی سے بے پروائی کا۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اور اس کے بعض شواہد دوسری فصل میں بیان ہوئے ہیں۔

هٰذا اٰخر ما تیسر لنا ذکرہ فی تفسیر هذہ السورۃ والحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلاۃ علی سیدنا محمد واٰلہ اجمعین